اٹھارہ مہینے ہندوستان میں

مُصنّف کی دُوسری کتابیں

جگ بیتی جلد اوّل .... قیمت پانچ روپیہ (صہ ر)

جگ بیتی جلد دوم .... (زیر طبع)

میری کہانی جلد اوّل .... "

میری کہانی جلد دوم .... "

باپ کے خط بیٹی کے نام .... "

سوویٹ روس .... قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اٹھارہ مہینے ہندوستان میں

جواہر لال نہرو

مترجمہ

بشیر احمد انصاری
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

اردو مرکز، مفتی والان دہلی

قیمت مجلد

منشی عبدالقدیر، مالک خالد کمپنی دہلی نے
دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی میں طبع کراکر
شائع کی

پہلا ایڈیشن، مئی سنہ ۱۹۴۵ء

سول ایجنٹ
اردو مرکز مفتی والان دہلی

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
۱۔	دیباچہ	۷
۲۔	۱۹۳۶ء کی مجلس عاملہ	۹
۳۔	ایک مصنّف کے جوابات	۱۲
۴۔	حقیقت	۲۲
۵۔	سرِ راہ	۲۶
۶۔	دورے کا کام	۳۱
۷۔	طلباء اور سیاسیات	۳۵
۸۔	پدوکوٹاہ کا ایک ہسپتال	۴۱
۹۔	کلکتہ	۴۴
۱۰۔	کانگریس کی صدارت	۴۷
۱۱۔	خطبۂ صدارت فیض پور نیشنل کانگریس	۵۳
۱۲۔	اشتراکیوں کے نام ایک پیغام	۸۸
۱۳۔	دورے پر ایک نوٹ	۹۰
۱۴۔	الیکشن کے پیغامات (بہار)	۹۳
۱۵۔	صوبہ جات متحدہ (ا)	۹۵

دیباچہ

مختلف مضامین اور بیانات کے اس مجموعے کا نام کچھ ایسا ہی کہ پڑھنے والے غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کتاب نہ تو ہندوستان کے پچھلے اٹھارہ مہینوں کی تاریخ ہی اور نہ کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی داستان جو ہندوستان دیکھنے آیا ہو۔ میں مارچ ۱۹۳۶ء میں یورپ سے واپس آیا تو کانگریس کی صدارت کے فرائض میرے سپرد کر دئے گئے۔ یہ زمانہ ہندوستانی سیاست کے ہر آن بدلنے والے ڈرامے کا ایک ایسا ٹکڑا ہی جس کا ہر منظر واقعات سے پُر نظر آتا ہے۔ مجھے بہ حیثیت کانگریس کے صدر کے اس ڈرامے میں نمایاں حصہ لینا پڑا۔ ایک طرح سے یہ زمانہ ہماری تحریک آزادی کے ارتقار کا ایک نیا دور کہا جا سکتا ہی۔ جس میں نئے خیالات پھیلے، نئی امیدیں پیدا ہوئیں، نئی مشکلات اور نئے ہنگاموں کا سامنا ہوا اور نئے مسائل کا حل سوچنا پڑا۔ اس مختصر سے زمانے کی تاریخ بہت مفید ہوگی مگر اس کے لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ اس درمیان میں اگر کچھ مواد ایسا جمع کر دیا جائے جو اس تاریخ کو سمجھنے میں مدد دے سکے تو کچھ نہ کچھ کام ضرور چل سکتا ہے۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر مختلف اہمیت اور حیثیت کے مضامین کا یہ کشکول پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضامین اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بعض واقعات و رجحانات کے بارے میں میرے اپنے تاثرات ہیں، مگر اس کے باوجود آج کے ہندوستان اور اس کے گوناگوں مسائل کے سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے سکتے ہیں۔

ان مسائل کی حیثیت اب صرف اس کے گھریلو معاملے کی سی نہیں رہ گئی ہے بلکہ وہ دُنیا کے ان مسائل کا ایک حصّہ ہوتے چلے جا رہے ہیں جن سے آج انسانی سماج میں ہل چل مچی ہوئی ہے، اور ہندوستان میں اس حقیقت کا شعور بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین، فلسطین اور چین کے واقعات نے ہندوستان والوں میں اس قدر جوش پیدا کر دیا ہے۔

الہ آباد۔
جنوری ۱۹۳۸ء

جواہر لال نہرو

۱۹۳۶ء کی مجلس عاملہ

کانگریس کے دستور کی رو سے صدر کانگریس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے زمانۂ صدارت کے لئے مجلس عاملہ کے ارکان خود منتخب کرے۔ چنانچہ یہ بوجھ مجھ پر بھی ڈالا گیا ہے اور مجھے بھی یہ فرض پورا کرنا ہے۔ میں نے اس معاملہ میں بہت احتیاط برتی ہے اور بہت سنجیدگی سے اس پر غور کیا ہے۔ میں نے اپنے رفقار کار سے بھی اس معاملہ میں مشورہ لیا ہے اور ان کی رہنمائی حاصل کی ہے۔ مجھے اس کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ میں کچھ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ صدر ہونے کی وجہ سے میں کانگریس کا سب سے بڑا افسر ہوں اور [illegible] شان اولے کی اکثریت کا نمائندہ سمجھا جاتا ہوں۔ لیکن بعض اہم معاملات میں میں اکثریت کے نقطۂ نظر کی نمائندگی نہیں کرتا، جو لکھنؤ کانگریس کی تجویزوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے میں ایسی مجلس عاملہ نہیں بنا سکتا تھا جو ان معاملات

میں میرے خیالات کی بھی نمائندگی کرسکے اور اکثریت کے خیالات کی بھی
میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ نامناسب ہوگا کہ میں ایسی کمیٹی نامزد کردوں جس
کے کل ممبر میرے ہم خیال ہوں۔ بلکہ مجھے کانگریس کی اکثریت کے نقطۂ نظر
کو مدنظر رکھنا چاہیے جو پچھلے اجلاس میں ظاہر کیا گیا ہے۔ پہلے میں نے یہ ارادہ
کیا کہ میں انتخاب کا معاملہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر چھوڑ دوں تاکہ وہ
ایسے لوگ چن لے جو اس کی نمائندگی کریں اور جنھیں وہ موزوں سمجھے لیکن
بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا یہ طرز عمل مناسب نہیں۔
مجھے اس ذمہ داری سے جو مجھ پر عائد ہوتی ہے پہلو نہ بچانا چاہیے۔ اس
لئے میں نے مجلس عاملہ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس مجلس میں زیادہ
تر اکثریت کے نمائندے ہیں۔ لیکن اس میں چند ایسے لوگ بھی ہیں
جو اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس قسم کے انتخاب میں بعض خرابیاں بھی ہیں۔
تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ یہ ایسی کمیٹی ہو جس کے اراکین برطانوی سامراج
کے خلاف جدوجہد میں مل کر کام کرسکیں۔ اور اس عظیم الشان جنگ آزادی
میں ملک اور کانگریس کی خدمت نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔
مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ جو لوگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کام کر رہے
ہیں اور تمام کانگریسی حضرات اس مجلس عاملہ کے ساتھ نہایت خلوص
سے تعاون کریں گے، اور اس بڑے کام میں جو اس وقت ہمارے سامنے
ہے اس کا ساتھ دیں گے اور اسے تقویت پہنچائیں گے۔ تاکہ ہم سامراج کے
خلاف ایک نہایت مضبوط متحدہ محاذ قائم کرسکیں۔

مجلس عاملہ کی تعداد دستور کے مطابق پندرہ اراکین تک
محدود ہے جن میں صدر بھی شامل ہے۔ اس لئے میں جتنے لوگ

کمیٹی میں لینا چاہتا تھا ان میں سے بعض کو نہ لے سکا اور مجھے خاص طور سے اس بات کا افسوس ہے کہ چند ایسے پرانے اور قابلِ قدر ارکان جو پچھلے برسوں تک مجلس عاملہ کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اس انتخاب میں چھوٹ گئے۔ تاہم مجھے اُمید ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اب بھی اسی طرح تعاون کریں گے اور ہم بھی اُن سے اکثر مشورہ لیا کریں گے۔

میں مندرجہ ذیل چودہ اراکین مجلس عاملہ کے لئے منتخب کرتا ہوں:

خازن :-

شری جمنا لال بجاج۔

جنرل سکریٹری :-

شری جے، بی، کرپلانی۔ مولینا ابوالکلام آزاد۔ شری راجندر پرشاد شری دلیپ بھائی جے پٹیل۔ خان عبدالغفار خاں۔ شری سی، راج گوپال اچاریہ۔ شری سبھاش چندرا بوس۔ شری نریندرا دیو۔ شری جے رام داس، دولت رام۔ شری ایس، ڈی دیو۔ شری جے پرکاش نرائن۔ شری بھولا بھائی ڈیسائی شری اچیت پٹ وردھن۔

جب تک خان عبدالغفار خاں جیل میں ہیں ڈاکٹر خان صاحب اُن کی جگہ کام کریں گے۔

اپریل ۱۹۳۶ء

ایک مصنّف کے جوابات

ایک مصنف کے لئے یہ بات نہایت نا مناسب ہے کہ وہ اپنے تنقید کرنے والوں سے بحث کرے وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اپنی کتاب میں کہہ چکا اب انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں بھی اپنی بات کہنے کا موقع دیا جائے میرا اپنی سوانح عمری کے تنقید کرنے والوں پر نکتہ چینی کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اس لئے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ کے تنقید نگاروں نے اس کتاب پر تبصرہ کرنے میں انتہائی فراخ دلی اور مہربانی سے کام لیا ہے جس سے میں بہت متاثر ہوا۔

لیکن مسٹر این، سی کیلکر اور دوسرے دوستوں نے مجھے مقابلے کی دعوت دی ہے اور کچھ سوالات پیش کرکے مجھ سے اُن کا جواب مانگا ہے۔ میں مسٹر کیلکر کی مدت سے عزت کرتا چلا آیا ہوں اور میں بالکل نہیں چاہتا کہ ان سے یا دوسروں سے اس مسئلہ میں اُلجھوں۔ لیکن مجھ سے سوالات

کیے گئے ہیں اور ایسی حالت میں میں بالکل خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔

میری سوانح عمری کیا ہے؟ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ گزشتہ چند برسوں میں جو اہم واقعات رونما ہوئے ہیں ان سب کو اس میں قلم بند کر دیا جائے۔ بلکہ وہ میرے اپنے خیالات اور کیفیات کی تصویر اور ان اثرات کی روداد ہے جو خارجی واقعات نے مجھ پر ڈالے میں نے کوشش کی ہے کہ یہ میرے ذہنی ارتقار کا آئینہ ہو۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا لیکن اصل چیز واقعات نہیں ہیں ... بلکہ وہ خیالات ہیں جو انھوں نے میرے ذہن میں پیدا کیے اور وہ اثر ہے جو انھوں نے مجھ پر ڈالا یہی اس کتاب کی سچائی کو پرکھنے کا معیار ہے۔

ظاہر ہے واقعات کی اصلیت اور اس اثر میں جو انھوں نے مجھ پر کیا اگر بہت زیادہ فرق ہو تو میری ہر دلیل باطل ہو جائے گی۔ اور میرے ذہن اور میرے خیالات کی تعمیر جھوٹ پر مبنی ہوگی، اور میں حقیقت سے دور ہو جاؤنگا اور اس پودے کی طرح جس کی جڑ کٹ گئی ہو مرجھا کر رہ جاؤں گا۔ اس لحاظ سے جو واقعات اس کتاب میں درج ہیں ان کا سچ یا جھوٹ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔

میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ اس کتاب کے نفسیاتی نقطۂ نظر سب سے مقدم ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے بہت سے تنقید نگاروں نے اس کتاب کو جانچنے میں یہی طریقہ برتا ہے اور میرے بہت سے انگریز دوست جو سیاسی معاملات میں مجھ سے سراسر اختلاف رکھتے ہیں۔ ایک حد تک ہماری قومی تحریک کی روح سے آشنا ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کتاب اگرچہ میں نے ایک فرد کی حیثیت سے ایک فرد کے متعلق لکھی ہے۔ لیکن میں ایک حد تک

یہ دعوے کر سکتا ہوں کہ اس میں میں نے ان بے شمار ہندوستانیوں کی ذہنی کشمکش کی نمائندگی کی ہے جنھوں نے آزادی کی تحریک میں کام کیا۔ نہ صرف دوست بلکہ مخالف بھی ایک دوسرے کو اس نفسیاتی بصیرت ہی کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ مخالف جماعتوں کا ایک دوسرے کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس لئے میں اپنے تنقید نگاروں کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ میری کتاب پر تنقید کرتے وقت اسی پہلو کو سب سے اہم سمجھنا چاہیے، اور سب پہلو محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

میری دوسری گذارش یہ ہے کہ ہمیں کتاب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہیے۔ ورنہ ہم جزئیات میں کھو جائیں گے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں اور خصوصاً ایک زبردست تحریک کے زمانے میں مختلف خیالات کا پیدا ہونا اور ان کا ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرنا ناگزیر ہے۔ یہ خیالات ان افراد یا رہنماؤں سے زیادہ اہم ہیں جو انھیں ظاہر کرتے ہیں اور یہ اُن سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے ان خیالات پر فی نفسہٖ غور کریں اور انھیں محض ان اشخاص کا جنھیں ہم پسند یا ناپسند کرتے ہیں دم چھلا نہ سمجھیں۔ پچھلے چند سال کے دوران میں ہماری سیاسی تحریک میں ایک خاص کانگریسی ذہنیت، ایک لبرل ذہنیت، ایک فسادی ذہنیت اور دوسری ذہنیتیں کام کر رہی تھیں۔ آج کل معاشی اور اجتماعی مسئلہ سب سے پیش پیش ہے۔ اس لئے اور نئے نئے

پیدا کر رہے ہیں۔ جب ہم ان مختلف خیالات و نظریات پر غور کریں، قطع نظر اس سے کہ یہ کن لوگوں کے خیالات ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں خیال ترقی پسندانہ ہے یا مضرت رساں ہے۔ وہ آزادی کی طرف لے جاتا ہے یا رجعت پسندی کی طرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ لبرل اور تعاونی ذہنیت قطعی طور پر رجعت پسندانہ اور مضرت رساں ہیں اور اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانوی سامراج کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ اس طرح وہ بجائے اس کے کہ ہمیں آزادی کے رستے پر چلنے میں مدد دیں۔ وہ برطانوی سامراج کو اور تقویت پہنچاتی ہیں۔ میری اس رائے کو ان اشخاص سے تعلق نہیں جو یہ خیالات رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں ان کی ذاتی قابلیت کی قدر کرتا ہوں، اُن سے محبت رکھتا ہوں اور ان کے حسن سیرت اور اُن کی جرأت کا معترف ہوں، اور اس کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ سیاسی حیثیت سے خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس نے ہمیں جو راہ دکھائی ہے وہ زیادہ سامراجی اور قطعی طور پر شہنشاہیت کے خلاف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی بعض معاملات میں اس کا طرز عمل رجعت پسندانہ ہوتا ہے، پھر بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمیں آزادی کی طرف دھکیل لے گئی ہے۔ اسی یقین کی وجہ سے میں نے اس کی اطاعت قبول کی ہے اور اپنی بساط بھر اُس کی خدمت میں لگا ہوا ہوں۔

اگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری قطعی رائے ہے تو کیا اس ڈر سے میں اُسے ظاہر نہ کروں کہ بعض لوگوں کے خیالات کو میری اس نکتہ چینی سے ٹھیس لگے گی؟ یہ تو بالکل مہمل اور بے ہودہ طرز عمل ہے

اور ایک قومی کارکن کے لئے ہرگز مناسب نہیں۔ ہم لوگ قومی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، اور کروڑوں انسانوں کی قسمت بدل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھلا ہم ایسے ضروری مسائل پر کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ پبلک کے معاملات پر آزادی سے تنقید کرنا میں اپنا حق سمجھتا ہوں اور مجھے دل سے اعتراف ہے کہ میرے مخالفوں کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم سچائی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں، اور ایک صحیح پالیسی کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ نکتہ چینی بدنیتی اور کینہ سے پاک ہونی چاہیے۔

یہ تھا وہ خیال جس کے ماتحت میں نے یہ کتاب لکھی۔ ممکن ہے کہ میں اس مقصد کو آخر تک نہ نبھا سکا ہوں۔ لیکن میرے اپنے سوچے سمجھے خیالات ان عقائد اور پالیسیوں کے متعلق جو اس وقت ملک کے سامنے ہیں۔ اس کتاب میں پورے پورے آ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں چھوٹی موٹی غلطیاں بھی ہو گئی ہوں مگر اُن سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ اخبارات نے اس قسم کی افواہوں کو غیر معمولی اہمیت دی ہے کہ میں اپنی کتاب اور اس کی مفروضہ غلطیوں کے لئے لوگوں سے معافی مانگتا پھرتا ہوں۔ لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ اب تک کتاب میں مجھے کوئی اہم غلطی ملی ہے۔

بعض لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ تعاونی پارٹی کے اراکین بھی کانگریس کے آزادی کے عقیدے پر صاد کرتے ہیں۔ میں انھیں اس پر مبارکباد دیتا ہوں۔ لیکن شخصی طور پر میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خواہ تعاونی پارٹی والے ہوں یا دوسرے کانگریسی ہوں

ان کا محض یہ کہہ دینا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ آزادی کے تخیل کو اس معنی میں جو میرے ذہن میں ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ بعض کانگریسیوں کو آزادی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں، اور وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ یہ آزادی کے تخیل کا نقش ہلکا ہو جائے اصل جانچ اُن کے عمل اور روز مرہ کے کاموں سے ہوتی ہے۔

میرا آزادی کا تخیل کہاں تک کانگریس میں کارفرما ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ کانگریسیوں میں یہ تخیل عام طور پر پھیلا ہوا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرا تخیل بنیادی طور پر اُن خیالات سے مختلف ہے جو سیاسی آزادی کے متعلق لبرل اور تعاونی پارٹی کے لوگ بحیثیت جماعت ظاہر کرتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں لبرل اور تعاونی پارٹی والوں کا یہ تخیل اگرچہ بظاہر ہندوستان میں برطانوی استبداد کا مخالف ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محور وہی برطانیہ کا سامراج ہے۔ اس لئے اگر وہ اس سے نفرت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اصل میں ان کی یہ کوشش برطانوی حکومت کی مدد اور اس کی جڑوں کو ہندوستان میں مضبوط کرتی ہے۔ وہ حکومت سے اکثر تعاون کرتے ہیں اور اسے ایک طرح کا اخلاقی سہارا دیتے ہیں یہ صورت ہماری تحریک آزادی کے لئے نہایت مضر ہے۔ ان میں سے بہت سے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی فوج کا عمل دخل باقی رہے یہ ایک ایسا خیال ہے جس کو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ درجہ نوآبادیات کا تصور تمام کا تمام ایک ایسا تصور ہے جس کا تسلیم کرنا میرے نزدیک برطانوی سامراج کی بنیادی

اصول کو تسلیم کرنا ہے۔ میں اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ سامراج کیا ہے؟ کون سی چیزیں اس کی ترقی کا باعث بنتی ہیں؟ اس کے متعلق ہمارے خیالات بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہم مختلف مقدمات سے مختلف نتیجہ نکالتے ہیں

لبرل اور تعاونی پارٹی کے لوگ پچھلے دنوں بارہا حکومت برطانیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ مثلاً وزارت، ایگزیکیٹو کونسل کی ممبری وغیرہ۔ ان عہدوں کے قبول کرنے کا محرک کچھ بھی ہو مگر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا لازمی نتیجہ سامراجی نظام سے دلی تعاون اور اس کی پشت پناہی ہے۔ گویا یہ لوگ تحریکِ آزادی کو دبانے میں حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس کا ہمیں پچھلے دنوں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ مسٹر این سی کیلکر نے ایک دفعہ اپنی پارٹی کے ایک رکن کو جو ایگزیکیٹو کے ممبر مقرر ہوئے تھے علی الاعلان مبارک باد دی تھی۔ اسی طرح اگر کانگریس بھی یہ فیصلہ کرے کہ جدید دستور کے مطابق اُسے عہدے قبول کر لینے چاہئیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسی قدر برطانوی سامراج کا ساتھ دے گی اور اُسے تقویت پہنچائے گی جس حد تک وہ اس سے تعاون عمل کرنا چاہتی ہے اور آئندہ جبر و تشدد یا حقوقِ شہریت کو کچلنے کی کچھ ذمہ داری اس پر بھی آئے گی۔

لبرل اور تعاونی پارٹی نے بارہا جبر و تشدد اور لوگوں کو حقوقِ شہریت سے محروم رکھنے کی مذمت کی ہے۔ لیکن میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ مذمت بجائے خود جبر و تشدد کی نہیں بلکہ اس کی مقدار کی تھی۔ اس لئے! کہ ان حضرات کو عام طور پر حکومت کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق تھا کہ

جبر و تشدد ضروری ہے۔ مسٹر این سی کیلکر کا کانگریس کی مجلس عاملہ کے اراکین کی رہائی کے لئے حکومت پر زور دینا مجھے یاد ہے۔ موصوف نے اس کی دلیل یہ دی تھی کہ اس وقت صورت حال بہتر ہو گئی ہے اس لئے ان لوگوں کو رہا کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر انھوں نے پھر کوئی شرارت کی تو وہ دوبارہ جیل بھیجے جا سکتے ہیں۔ یہی دلیل میرے طرز خیال کے بالکل خلاف ہے۔ میرے نزدیک یہ حکومت کی عام پالیسی اور اس کی سابقہ کارروائیوں کو جائز ٹھہراتی ہے۔

اب ذرا اُن جوابات کو لیجئے جو سر سیوا سوامی آئیر اور سر تیج بہادر سپرو نے میری اس گشتی چٹھی کے دئے تھے جو میں نے حقوق شہریت کے بارے میں بھیجی تھی۔ مجھے اس بات کی کوئی شکایت نہیں کہ انھوں نے مجوزہ انجمن میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ انکار اور لوگوں نے بھی کیا تھا لیکن انھوں نے اس کے وجوہ وہ نہیں بتائے تھے جو ان دونوں حضرات نے بیان کئے۔ یہ وجوہ نہایت معنی خیز اور اہم ہیں۔ اور میں اُن سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ حقوق شہریت کو پامال کرنے میں حکومت برطانیہ کے نقطۂ نظر کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حکومت اس معاملے میں بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اسے ایسا نہ کرنا چاہئے۔

میرے نزدیک یہ ساری باتیں سامراجی ذہنیت کو قبول کرنے اور اس کی جبر و تشدد کی پالیسی کو مؤثر اخلاقی امداد پہنچانے پر دلالت کرتی ہیں۔ جس زمانے میں تمام ملک میں جبر و تشدد کی پالیسی نہایت سختی سے برتی جا رہی تھی تو ان لوگوں نے اور بہت سی سیاسی، نیم سیاسی

اور معاشرتی سرگرمیوں کے ذریعے سے حکومت کو اخلاقی امداد پہنچائی۔ جو لوگ دل میں ملک کا درد رکھتے تھے اور آرڈیننسوں اور جبر و تشدد کے احکام کو باعثِ ذلت سمجھتے تھے ان کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی تھی کہ وہ ان لوگوں سے خلا ملا رکھتے، اُن کے ساتھ دعوتیں اُڑاتے اور اُنھیں پارٹیاں دیتے جو اس جبر و تشدد کے ذمہ دار تھے۔ سوال سول نافرمانی کرنے والوں سے ہمدردی کرنے کا نہ تھا بلکہ اس کا تھا کہ وہ اس حکومت سے ہمدردی نہ کرتے جو ہندوستان کی روح کو کچل رہی تھی۔ یہ تو ایک معمولی انسانیت کا سوال تھا۔

یہ ہے میری فکر کا عام پس منظر جسے میں چاہتا ہوں کہ مسٹر کیلکر سمجھ لیں گو وہ اس سے بالکل اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ فکر کچھ وزن رکھتی ہے تو جن نتائج پر میں پہنچا ہوں وہ اس سے خود بخود نکلتے ہیں لیکن اگر ہم ایک دوسرے کو کج فہم اور ضدی کہتے رہیں اور ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرتے رہیں تو معاملات کی صفائی نہیں ہو سکتی۔

میں تعاونی پارٹی اور لبرل پارٹی دونوں کی تحریروں اور تقریروں سے اپنے قول کی تائید میں ایسے حوالے دے سکتا ہوں کہ ان جماعتوں کے سربر آوردہ اراکین سامراج کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن یہ مضمون پہلے ہی بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے میں صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

مسٹر ایم، آر، جیکار نے (غالباً ایک انٹرویو میں جو انھوں نے شروع ستمبر ۱۹۳۳ء میں ٹائمز آف انڈیا کو دیا تھا) اپنے ملک کے لوگوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ نئے آئین کو مصالحانہ انداز میں چلائیں۔ گورنروں

سے معاہدہ کریں کہ کسی بات میں اُن کی مخالفت نہ کریں تاکہ انھیں اپنے خانگی اختیارات استعمال کرنے کا موقع نہ ملے اب اگر اس کو ان نام نہاد اصلاحات اور اس سامراجی نظام کا جو ان اصلاحات کے پردے میں کام کر رہا ہے قبول کرنا نہ کہیں تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے اور کیا کہیں۔ مسٹر جیکار کے اس بیان پر سرونٹ آف انڈیا (۵ ستمبر ۱۹۳۵ء) نے جو تنقید کی ہے میں اس سے بہتر تنقید نہیں کر سکتا۔

پچھلے دنوں بارہا مسٹر مونجے نے برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کی اپیل کی ہے اور ان کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس پر انھیں کلکتہ کے سٹیسمین نے مبارک بادبھی دی تھی۔ ان کے فوجی مدرسے کے قیام پر کمانڈر انچیف نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ بھی سُنا گیا ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ یہ مدرسہ مملکتِ برطانیہ کی خدمت کرکے اپنی وفاداری کا ثبوت دے گا۔ ذاتی طور پر مجھے کوئی آرزو مملکتِ برطانیہ کی خدمت کی نہیں ہے اور نہ مجھے ان لوگوں سے کوئی ہمدردی ہے جو اس قسم کا جذبہ رکھتے ہیں۔ خیر اس کو تو چھوڑیے مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ جو لوگ مملکت برطانیہ کی خدمت کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے کی خواہش رکھتے ہیں ان کو کوئی سامراج کا مخالف نہیں کہہ سکتا۔

۱۶ر جون ۱۹۳۶ء

حقیقت

انتخابات ابھی بہت دور ہیں اس نقلی جنگ کے شروع ہونے میں نصف سال باقی ہے۔ لیکن اس کے سیاہ بادل افق سیاست پر منڈلا رہے ہیں اور لوگوں کی بھاری اور کرخت آوازیں ہمارے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہیں۔ ہمارے اخبارات ان کی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں اور ہمارے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ بہت کم کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جب میں نے پنجاب اور سندھ کا دورہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس ہنگامہ اور شور کی حقیقت کچھ یوں ہی سی ہے امیدواروں کے متعلق مباحثے، یہ سمجھوتے، یہ جوڑ توڑ، یہ سازشیں، محض ایسی ہیں جیسے پانی کی سطح پر بلبلے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس پانی کی سطح کے نیچے نئے دھارے بہہ رہے ہیں۔ مجھے ان کی زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ بڑے بڑے مجمع خصوصاً دیہات کے علاقوں میں شرکت کے

کنارے جمع ہوکر کیوں انتظار کیا کرتے ہیں۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ وہ ایک مشہور شخص کی تقریر سننے، یا اس کو دیکھنے یا محض کانگریس کی خدمت میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے جمع نہیں ہوتے، دراصل اُنھیں ایک زبردست ضرورت وہاں جمع کرتی ہے۔ وہ ایک طلب ہے جس نے انھیں بےچین کر رکھا ہے، اور وہ اس کی تسکین چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس ضرورت اور اس طلب کی کیفیت کو سمجھ لیں تو غالباً ہم ہندوستان کے صحیح مسئلہ کو سمجھ لیں گے۔

لیکن ہم انتخابات کی جنگ یا فرقہ دارانہ تصفیہ یا مسجد کے جھگڑے میں اتنے منہمک رہتے ہیں کہ یہ کروڑوں آدمی ہمارے سامنے سے گذر جاتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی، اور نہ ہم اُن کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ اُنھیں خود تو اتنی قدرت نہیں کہ وہ اپنی ضرورتوں اور طلب کا اظہار کرسکیں، اور ہم کسی اور ہی خیال میں مگن رہتے ہیں۔

پنجاب کے اُن ہزاروں زمینداروں کے مجمعوں کو دیکھ کر ایک غیرمعمولی اثر دل پر پڑتا تھا۔ وہ شہر والوں کی طرح جوشیلے اور بلند آہنگ نہ تھے اور اکثر ان میں جوش کی کوئی ظاہری علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے اور دیکھنے میں بالکل ٹھس معلوم ہوتے تھے مگر ان کی اس خاموشی میں ایک ذہنی کشمکش پنہاں تھی اور سادہ لوحی کی تہہ میں جو کسان میں ہوتی ہے قوت اور ایک زبردست بےچینی دبی ہوئی تھی۔ میں جب ان کی حرکات و سکنات کو دیکھتا تھا اور ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جو عرصہ تک سرد رہ چکا ہے۔ اور اب اندر ہی اندر اُبل رہا ہے

ایک سمندر ہے جس پر طوفان آنے سے پہلے تاریکی چھانی شروع ہوگئی ہو۔

بعض اوقات ہمارے جلسوں میں پولیس اور ذمہ دار افسروں نے مداخلت کی اور جلسوں کے منتظمین اور خاص طور سے وہ لوگ جن کے متعلق اشتراکی ہونے کا شبہ ہوا یا تو قید کرلیے گئے یا نظر بند کردیے گئے۔ جس کا مطلب صاف یہ تھا کہ اعلیٰ حکام ان جلسوں کو پسند نہیں کرتے :-

"ملک معظم کے حکم سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اے وہ لوگو
جن کی حالت خستہ ہے، اپنی ٹوپیاں اُتار ڈالو اس لئے
کہ حکام بالا کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم باغیوں کے ساتھ
خفیہ سازشیں کرتے ہو، اس ملک کے نظم اور امن کے
خلاف"

پھر بھی یہ خستہ حال لوگ ہزاروں کی تعداد میں آتے تھے اور ان کی زبان پر ہمیشہ لگان اور قرضوں کے بوجھ میں دب جانے کی شکایت ہوتی تھی اُن میں سے کوئی بھی فرقہ وارانہ تصفیہ یا شہید گنج یا مسلمانوں کے مطالبات یا ہندوؤں کے حقوق کے متعلق بات چیت نہ کرتا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب کے سب ایک ہی مصیبت میں مبتلا تھے اور اسی کے متعلق سوچتے اور گفتگو کرتے تھے یا اور جب میں اُن کے ساتھ بیٹھتا تھا تو شہروں کے اُن چھوٹے چھوٹے اختلافات کا کہیں دور دور بھی نشان نہ ملتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی کسانوں کے ان زبردست مسائل کے سامنے یہ چیزیں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔
خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو ہندوستانی کسانوں کی گتھی کو سلجھا سکیں گے۔ اور جو اس کو نہ سلجھا سکے وہ اسی طرح

پگھل کر غائب ہو جائیں گے۔ جس طرح گرمیوں میں پہاڑوں کی برف۔

۹ اگست ۱۹۳۶ء

سرِ راہ

ہمارا تمام دن جلسوں اور جلوس میں گذرا۔ انبالہ سے چل کر ہم کرنال، پانی پت اور سونی پت گئے، اور وہاں سے رہتک پہنچ گئے پنجاب کا دورہ آخرکار ختم ہو گیا اور اُسی کے ساتھ اُن جوش و خروش کے مظاہروں اور جگھٹوں سے نجات ملی جو ہمارے پہنچنے پر جگہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ اتنے دن کی بھاگ دوڑ سے چھٹکارا پاکر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور تکان کی وجہ سے یہ جی چاہتا تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو رہوں۔

رات ہو گئی اور ہم رہتک سے دلی جانے والی سڑک پر چل پڑے کیونکہ اُسی رات ہمیں دلی پہنچ کر گاڑی پکڑنی تھی۔ مجھ پر نیند اس درجہ غالب تھی کہ میں بہ مشکل آنکھیں کھلی رکھ سکتا تھا۔ اچانک ایک جگہ ہمیں اپنی گاڑی روکنی پڑی۔ وہاں بیچ سڑک میں عورتوں اور مردوں کا ایک مجمع بیٹھا تھا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں مشعلیں بھی تھیں۔ وہ لوگ

ہمارے قریب آئے اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہوگیا کہ ہم کون ہیں تو اُنھوں نے ہمیں بتلایا کہ وہ وہاں سہ پہر سے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ تگڑے جاٹوں کا ایک گروہ تھا۔ اکثر اُن میں سے چھوٹے زمیندار تھے ہم اُن سے بغیر دو باتیں کئے کسی طرح بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اس لئے ہم گاڑی سے اُتر پڑے اور اس دھندلکے میں وہیں بیٹھ گئے۔ اور ہمارے ارد گرد یہ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ جاٹوں کا مجمع اکھٹا ہوگیا۔

ان میں سے ایک نے کہا: "قومی نعرہ" اور اُسی کے ساتھ ایک ہزار آوازوں نے تین مرتبہ زور سے "بندے ماترم" کہا۔ اور اس کے بعد "بھارت ماتا کی جے" اور دوسرے نعرے بلند ہوئے۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ اس "بھارت ماتا کی جے" اور "بندے ماترم" کا کیا مطلب ہے؟ جواب ندارد۔ سب کے سب پہلے میری طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے سوال سے کچھ پریشان ہوگئے میں نے اپنا سوال پھر دہرایا "یہ نعرے لگانے سے آپ لوگوں کا کیا مطلب ہے؟" پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ کانگریس کا رضاکار جس کے سپرد یہ علاقہ تھا دل ہی دل میں گھُٹ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوال کا جواب دے۔ لیکن میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔

میں نے پھر پوچھا: "یہ ماتا کون تھی جس کے سامنے آپ لوگ جھک رہے تھے اور جس کی جے پکار رہے تھے؟" وہ اب بھی اسی طرح خاموش اور حیران بیٹھے رہے۔ اُن سے کبھی کسی نے اس قسم کے انوکھے سوالات نہیں کئے تھے۔ اُن سے جو کچھ کہا گیا تھا اُنھوں نے مان لیا تھا۔ اور جو موقعے مخصوص نعرے کے لئے بتائے گئے تھے ان پر وہ نعرے

لگا دیا کرتے ۔ مطلب سے اُنھیں کچھ غرض نہ تھی ۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر کانگریس والے چاہتے ہیں کہ ہم نعرے لگائیں تو ہم نعرے لگائیں تو ہم ضرور نعرے لگائیں گے اور بڑے زور شور سے ۔ یہ کوئی اچھی ہی بات ہوگی ۔ یہ نعرہ ان میں زندگی پیدا کرتا تھا اور اُن کے مخالفوں کے دل میں خوف ۔

میں پھر بھی اپنے سوال پر زور دیتا رہا ۔ آخر اُن میں سے ایک شخص جو بہت جری معلوم ہوتا تھا اٹھا اور اُس نے جواب دیا "ماتا سے مراد دھرتی یعنی زمین ہے" کسان ہونے کی وجہ سے اس کا خیال زمین کی طرف گیا ۔ جو صحیح معنوں میں اس کی ماں اور محسنہ ہے ۔

میں نے مزید سوال کیا "کون سی زمین ؟ گاؤں کی زمین یا پنجاب کی یا تمام دنیا کی ؟" انھیں میرے پیچ در پیچ سوالات سے تکلیف ہونے لگی ، اور وہ اُلجھن میں پڑ گئے ۔ آخر مجمع سے ایک ساتھ بہت سی آوازیں آئیں ۔ "آپ ہمیں خود ہی اس کے متعلق سب کچھ تبلا دیجیے" یہ لوگ بالکل بے خبر تھے اور سمجھنا چاہتے تھے ۔

میں نے اُنھیں بتلایا کہ بھارت کسے کہتے ہیں اور ہندوستان کیا ہے اور یہ وسیع ملک کہاں تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے شمال میں کشمیر اور ہمالیہ ہے اور جنوب میں اس کی حد لنکا تک چلی گئی ہے ۔ اور کس طرح یہ پنجاب ، بنگال ، بمبئی اور مدراس جیسے بڑے صوبوں میں منقسم ہے ۔ آپ کو اس عظیم الشان ملک میں اپنے ہی جیسے کروڑوں انسان ملیں گے ۔ اُنھیں بھی ایسے ہی مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے جن میں آپ لوگ اُلجھے ہوئے ہیں ۔ وہ بھی انھی تکلیفوں اور مصیبتوں میں

مبتلا ہیں۔ غربت اور مصیبت انھیں بھی اسی طرح کچل رہی ہے۔ یہ ہے وہ بڑا ملک جو ہندوستان اور بھارت ماتا کہلاتا ہے۔ وہ ہمارا ہے اور ہم سب اُس کے باشندے ہیں۔ اور بھارت ماتا کے بچے ہیں۔ بھارت ماتا جیسا کہ بعض اوقات فرضی تصویروں میں دکھایا جاتا ہے یہ یا رومد دکا لمبی لمبی زمین بوس زلفوں والی کوئی حسین عورت نہیں ہے۔

بھارت ماتا کی جے۔ بھلا بتلاؤ تو ہم نے کس کی جے پکاری؟ ظاہر ہے کہ یہ اس فرضی عورت کی جے نہیں ہے، جس کا وجود نہیں۔ تو کیا پھر یہ ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں، ریگستانوں، درختوں اور پتھروں کی جے ہے؟ ان سب نے کہا "نہیں" لیکن وہ کوئی صحیح جواب نہ دے سکے۔

میں نے اُن سے کہا "یقیناً ہم نے اُن کروڑوں انسانوں کی جے پکاری تھی جو ہندوستان کے دیہاتوں اور شہروں میں بستے ہیں۔" اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی سمجھ میں صحیح بات آگئی۔ یہ لوگ کون ہیں "تم اور تمھارے بھائی بند ہیں۔ اس لئے جب تم بھارت ماتا کی جے پکارتے ہو تو گویا اپنی اور ہندوستان میں بسنے والے اپنے تمام بھائی بہنوں کی جے پکارتے ہو۔" انھوں نے میری بات بہت غور سے سنی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے تاریک کسان دماغوں کو کسی نے منور کر دیا ہے۔ اُن کے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ وہ نعرہ جو وہ عرصے سے لگاتے چلے آئے تھے اُنھی سے متعلق ہے۔ آؤ اب ہم سب مل کر دل سے یہ نعرہ پھر لگائیں۔

"بھارت ماتا کی جے!"

پھر ہم اسی تاریکی میں شہر دہلی پہنچ گئے۔ ریل میں بیٹھے اور میں ایک گہری نیند سو گیا۔

۱۶ر ستمبر ۱۹۳۶ء

دورے کا کام

دورے کرنے کا کام میرے لئے روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں دورہ ایک بار شروع ہوا اس کی لے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ مجمع زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے اور بے شمار انسانوں کے اس ہجوم کی وجہ سے سارا پروگرام خواہ وہ کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ بنایا گیا ہو اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ اس تمام جوش و خروش کو دیکھ کر ایک خوشی اور سرورگی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے کم از کم آدمی کی جسمانی قوت میں ایک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس اضافہ کی بھی ایک حد ہے اور بارہ گھنٹے روزانہ کا پروگرام بڑھ کر اٹھارہ گھنٹے روزانہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر بھی پورا نہیں ہوتا۔ حاضرین گھنٹوں بے کار انتظار کرتے کرتے جب مایوس ہو جاتے ہیں تو انھیں غصہ آ جاتا ہے اور ان کا غصہ مقامی منتظمین پر اُترتا ہے جو ہی

معاملہ میں مطلق بے قصور ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات اس ہنگامہ اور جوش و خروش کے ختم ہو جانے کے بعد ایک بد مزگی باقی رہ جاتی ہے۔ یہ خرابی بڑی حد تک دور کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ یہ صورتِ حال نہ پیدا ہو۔

ان مشکلات کا باعث کچھ تو وہ پروگرام ہیں جو دوسرے کے لئے بنائے جاتے ہیں اور کچھ بیرونی اسباب۔ یہ پروگرام اتنے لمبے چوڑے ہوتے ہیں کہ قطع نظر اس کے کہ انہیں پورا کرنے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اکثر صورتوں میں وہ پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ دن تو کسی طرح کھینچ کر چوبیس گھنٹے سے زیادہ بڑھا نہیں سکتے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو بہت بڑے مجمع سے سابقہ پڑے اُسے قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے۔ پچاس ہزار عورتوں اور مردوں کے جلوس کو بالکل نظام اوقات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اتنے بڑے جلسے میں ڈائس تک پہنچنے یا وہاں سے واپس آنے میں بھی دیر لگتی ہے۔ پھر ہزاروں کے مجمع کو کسی جلسے میں قرینے سے بٹھا دینا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے ایک بہت بڑا عملہ چاہیے جو جلسے سے پہلے یہ سارے انتظامات کرے غرض نتیجہ یہ ہے کہ دیر پر دیر ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ تو انجام ہوتا ہے معینہ پروگرام کا۔ اب اُن جلسوں اور جلوسوں کو لیجئے جن کی پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی اور نہ پروگرام میں ان کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ ہر چند میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک مجمع گھنٹوں سے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آدمی اُن کی طرف سے منہ پھیر کر گذر جائے۔

لامحالہ اُسے ٹھہرنا اور ان کے پرخلوص استقبال کا شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ایک چھوٹی سی تقریر بھی۔ اکثر جو گاؤں راستے میں پڑتے ہیں وہ خوب سجائے جاتے ہیں اور سڑکوں پر بڑے بڑے دروازے لگائے جاتے ہیں، جنھیں وہ بڑی محنت سے تیار کرتے ہیں اور قصبہ یا گاؤں کی آدمی آبادی گھروں سے نکل کر بستی کے نکڑ پر آ بیٹھتی ہے، اور گھنٹوں انتظار کرتی رہتی ہے۔ جب خلوص محبت کا یہ حال ہو تو آدمی کیا کرے۔ اس کی طاقت کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔

بہت سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے مجمع کے مجمع میری طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور مجھے دیکھ کر ان میں ایک حیرت انگیز جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ کسی حد تک میری ہر دلعزیزی ہے لیکن میرے خیال میں زیادہ تر یہ چیز کانگریس کے اثر اور اقتدار کا نتیجہ ہے۔ بہر حال وجہ جو بھی کچھ ہو اتنی بات ظاہر ہے کہ انسانوں کے ان بڑے بڑے پرجوش مجمعوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ساتھ مناسب اور معقول برتاؤ کرنا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ پروگرام آئندہ ان مشکلات پر خوب غور و خوض کرنے کے بعد بنائے جائیں گے۔ یہ پروگرام نہایت معقول ہونے چاہئیں۔ اور ایسے کہ جنھیں پورا بھی کیا جا سکتا ہو۔ ان میں سرِ راہ مجمعوں کی اور اُن جلسوں کی جن کی پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی کافی گنجائش رکھنی چاہیے۔ جلوس بالکل اُڑا دینے چاہئیں۔ البتہ مجبوری کی حالت میں مضائقہ نہیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے جلسے نہیں ہونے چاہئیں (اگرچہ یہ چھوٹے جلسے اکثر بڑے ہو جاتے ہیں) بہتر یہ ہے کہ چند بڑے

بڑے جلسوں پر اکتفا کی جائے ؛ اور ان میں مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ آدمی کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اتنے بڑے مجمع سے بغیر کسی آلے کی مدد کے خطاب کر سکے۔

میں یہ تنقید تو بے شک کر رہا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میں کانگریس میں کام کرنے والوں اور منتظمین کا بے حد ممنون بھی ہوں، جن پر میرے دوروں کے پروگرام مرتب کرنے کا بوجھ پڑتا ہے انھوں نے اس سلسلے میں نہایت محنت سے کام کیا ہے اور اس میں اپنی جان کھپا دی ہے۔ لیکن ان کی محنتوں کو لوگوں نے جس شاندار طریقے سے سراہا ہے اس نے انھیں اور مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اس غیر معمولی جوش کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہے گی اور میری روح کو تازگی بخشے گی۔ مجھے فخر اور مسرت ہے کہ میرا تعلق ایک ایسی جماعت سے ہے جس نے اپنی طویل خدمت اور قربانی کی بدولت اپنے کروڑوں ملکی بھائیوں کے دلوں کو اس حد تک موہ لیا ہے اور ان میں اپنی ساکھ قائم کر لی ہے

۱۶ ر ستمبر ۱۹۳۶ء

طلبار اور سیاسیات

اس وقت ہندوستان ایک عجیب دور سے گذر رہا ہے۔ اور ایسے سوالات اُٹھائے جا رہے ہیں کہ آدمی حیران ہوکر رہ جاتا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے آزادی مُضر ہے۔ اور ایک چیز جو آزادی سے کم درجے کی ہے درحقیقت ہندوستان کے لئے آزادی سے بڑھ کر ہے۔ میں فلسفیانہ طبیعت نہیں رکھتا اس لئے مجھے ان باریکیوں کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ایک اور انوکھا سوال ہے جو طلبار اور سیاست کے عنوان سے متعلق ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ طلبار کو سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیئے۔ سیاست کے کیا معنی ہیں؟ ہندوستان (سرکاری حلقوں) میں معمولاً اس کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت کی امداد اور حمایت کرنا خواہ وہ کسی طرح بھی کی جائے سیاست نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کے رائج الوقت

قانون پر تنقید کرنا یا اس کے خلاف کام کرنا سیاست کہلاتا ہے۔

طلبار کون ہیں؟ یا تو وہ بچے ہو سکتے ہیں جو ابتدائی مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں یا کالج میں پڑھنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی اصول دونوں طرح کے طالب علموں پر عائد نہیں ہو سکتا۔

آج بڑے طالب علموں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو آنے والی صوبجاتی انتخابات میں رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ رائے دینا بجائے خود سیاست میں حصہ لینا ہے۔ سمجھ بوجھ کر رائے دینے کے لئے سیاسی مسائل کو سمجھنا ضروری ہے سیاسی مسائل کو سمجھنے کا نتیجہ معمولاً کسی مخصوص سیاسی پالیسی کو تسلیم کرنا ہوتا ہے اور اگر کوئی اس مخصوص سیاسی پالیسی کو تسلیم کرتا ہے تو شہری ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اس پالیسی کی تائید کرے۔ اور کوشش کرے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے ہم خیال ہو جائیں۔ اس طرح یہ لازمی بات ہے کہ ایک ووٹ دینے والا سیاسی آدمی ہوگا اور اگر وہ ایک سمجھ دار اور ہوشیار شہری ہے تو اُسے ایک سرگرم سیاسی آدمی بھی ہونا چاہیے صرف وہ لوگ جنھیں سیاسی اور جماعتی معاملات سے کوئی مس نہیں غیر جانبدار یا سیاست سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔

رائے دہندگی کے فرض سے قطع نظر کر کے دیکھئے۔ تب بھی ہر طالب علم کو زندگی اور اس کے مسائل کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تعلیم بالکل بے کار ہے۔ سیاسیات اور معاشیات انھی مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ اور کوئی شخص اس وقت تک صحیح تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ ان مسائل کو نہ سمجھتا

ہو۔ زندگی کے پیچ در پیچ راستوں میں سیدھا راستہ پالینا اکثر لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن خواہ ہم کسی مسئلہ کا حل معلوم کرسکیں یا نہ کرسکیں ہمیں کم سے کم مسئلہ کی نوعیت سے واقف ہونا چاہیئے۔ وہ سوالات کیا ہیں جو زندگی ہمارے سامنے رکھتی ہے؟ خواہ اُن کے جوابات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لوگ سوالات کو سمجھے بغیر جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی سنجیدہ اور غور کرنے والا طالب علم ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا پسند نہ کرے گا۔

قومیت، حریت، اشتراکیت، اشتمالیت، شہنشاہیت فاشیت وغیرہ مختلف نظرئے جو آج کل دنیا میں اس قدر اہم حیثیت رکھتے ہیں ان سوالات کا جواب دینے کی کوششیں ہیں جو مختلف جماعتوں نے کی ہیں۔ ان میں سے کون سا جواب صحیح ہے؟ یا وہ سراسر غلط ہیں؟ ہر صورت ہمیں کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا ہوگا۔ فیصلہ کرنے کے لئے ہم میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہمارے خیالات اور ہمارے اعمال پر پابندیاں عائد ہیں۔ اگر اعلیٰ حکام ہمارے سروں پر مسلط رہیں اور ہمیں آزادی سے سوچنے کا موقع نہ دیں تو ہماری یہ صلاحیت نہیں اُبھر سکتی۔

لہٰذا ان سب لوگوں کے لئے جو سوچنے کی قوت رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ طالب علموں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پورے طریقے سے سیاست کے نظری حصہ کا مطالعہ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت انھی طالب علموں کے لئے ہے جو عمر میں بڑے ہیں اور زندگی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ چھوٹی عمر کے طلبا ابھی ان مسائل سے بہت دور

ہیں۔ فی الحال انھیں اس چیز کی ضرورت نہیں، لیکن کسی چیز کو پوری طرح سمجھنے کے لئے محض نظری مطالعہ کافی نہیں ہوتا۔ ہر علم کے لئے عمل درکار ہے۔ اگر محض مطالعہ ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کالج کی چہار دیواری سے نکل کر گاؤں، قصبہ کھیل کے میدان اور مل میں جائے اور حقیقت کی چھان بین کرے اور ایک حد تک لوگوں کی مختلف سرگرمیوں میں حصہ لے۔ اس میں سیاسی سرگرمیاں بھی شامل ہیں لیکن عام طور پر ہر کام کی کوئی نہ کوئی حد مقرر کرنی پڑتی ہے ایک طالب علم کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دماغ اور جسم کی تربیت کرے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے میں اس کا پورا پورا ساتھ دے سکیں جب تک یہ تربیت نہ ہو اس کی فکر اور عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ لیکن خود تربیت کے لئے محض پند و نصیحت کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ایک حد تک عمل کی بھی ضرورت ہے عام حالات میں عمل کو نظری تربیت کے ماتحت ہونا چاہیئے لیکن عمل کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ورنہ خود تربیت ناقص رہ جائے گی۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کے طریقہ تعلیم میں توازن بالکل نہیں ہے لیکن اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیم تحکم کے ماحول میں گھری ہوئی ہے۔ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں ہر جگہ وردی پوش خود نما اور مُسکت تحکم لوگوں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ذہن کو نشو و نما پانے اور خیالات کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ حال ہی میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ تحکم نے کھیل کی دنیا میں بھی سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اور انگلستان میں ہماری کرکٹ ٹیم جس میں اعلیٰ درجے کے کھلاڑی تھے اپنے نا اہل منتظموں کی بدولت ناکام رہی۔ قابلیت کو تحکم کے

آگے سر جھکانا پڑا۔ ہماری یونیورسٹیوں میں تحکّم کا دور دورہ ہے۔ جو کان دبا کر اطاعت نہ کرے اس پر ضبط کے نام سے حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ نامعلوم مقامات کو ڈھونڈھ نکالنے کا شوق وجذبہ اور جرأت و دلیری جیسی صلاحیتوں کو، جنھیں آزاد ملکوں میں سراہا جاتا ہے یہ لوگ بالکل پسند نہیں کرتے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ بات قابل تعجب ہے کہ ہم زیادہ تعداد میں ایسی عورتیں اور ایسے مرد پیدا نہیں کرتے جن کے دل میں یہ حوصلہ ہو کہ قطبین کو سر کریں یا عناصر پر فتح پائیں اور ان سے خدمت لیں۔ انسان کی جہالت، بزدلی، جمود اور عجز کا پردہ فاش کریں، اور اسے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچانے کی کوشش کریں؟

کیا طالب علموں کو سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے؟ کیا انھیں زندگی کی گوناگوں سرگرمیوں میں مناسب طور پر شرکت کرنی چاہیے۔ یا محض کلرک بن کر افسران بالا کے احکام کی تعمیل کرتے رہنا چاہیے؟ یوں بھی وہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے سیاست سے الگ نہیں رہ سکتے، اور ہندوستانی طالب علم ہونے کی حیثیت سے تو انھیں اور بھی زیادہ اس میں حصہ لینا چاہیے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ معمولی حالت میں اُن کا سب سے بڑا مقصد اپنے جسم اور دماغ کی تربیت ہونا چاہیے، اس لئے کہ یہ زمانہ ان کی قوتوں کے نشو و نما کا زمانہ ہے۔ انھیں کسی نہ کسی نظم کا بھی پابند ہونا چاہیے۔ لیکن وہ نظم ایسا نہ ہو جو ان کی ذہنی قوتوں کو کچل دے اور اُن کے دلولوں کو سرد کر دے۔

یہ تو معمولی حالات کا ذکر ہے لیکن غیر معمولی حالات میں معمولی قانون اور قاعدے کام نہیں دیتے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں انگلستان

فرانس اور جرمنی کے طالب علم کہاں تھے ؟ وہ اپنے کالجوں میں نہیں تھے بلکہ میدانِ جنگ میں موت کا سامنا کر رہے تھے۔ آج ہسپانیہ کے طالب علم کہاں ہیں ؟

ایک غلام ملک کے حالات، ایک حد تک ہمیشہ غیر معمولی ہوتے ہیں ۔ یہی حالت آج ہندوستان کی ہے۔ ان مسائل پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے ماحول اور دنیا کی بڑھتی ہوئی غیر معمولی حالت پر بھی نظر چاہیے جب ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم واقعات کی تشکیل میں حصہ لیں۔ خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو ؟

یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء

| < < < |

پڈوکوٹاہ کا ایک ہسپتال

ایک ہی طرح کے واقعات بار بار پیش آنے سے آدمی ذرا اُکتا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے پدوکوٹاہ کے واقعہ نے ایک تنوع پیدا کر دیا۔ جب ہم پدوکوٹاہ قصبہ میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہاں کی فوج سڑک کے چاروں طرف پرا جمائے کھڑی ہے مجھے یہ چیز دلچسپ معلوم ہوئی۔ آگے چل کر فوج کا ایک بڑا دستہ سڑک پر کھڑا تھا۔ اب میری دلچسپی اور بڑھ گئی اور میں موٹر سے اُتر ا اور ایک شخص سے جو یا تو پولیس کا افسر تھا یا فیلڈ مارشل پوچھا کہ یہ فوج وغیرہ یہاں کیوں جمع ہے۔ آیا فوج نقل و حرکت کا مظاہرہ کر رہی ہے یا بین الاقوامی صورتِ حال سے متاثر ہو کر ریاست نے آنے والے خطرے سے بچنے کے لئے یہ تیاریاں کی ہیں اس نے جواب

لہ پدوکوٹاہ حاطہ مدراس میں ایک چھوٹی سی دیسی ریاست ہے۔

دیا کہ فوج وہاں محض میرے جلوس کا انتظام کرنے آئی ہے، تاکہ مجمع سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔ درحقیقت پدو کوٹاہ ریاست کی طرف سے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی ایسی عزت افزائی تھی جو میرے لئے ایک انوکھی چیز تھی۔ میرا ہر طرح کے لوگوں اور مجمعوں کی طرف سے بارہا شاندار استقبال ہوا ہے۔ لیکن ایک وائسرائے کی طرح فوجوں کے جھرمٹ میں سڑک پر سے گذرنے کا اتفاق آج تک کبھی نہ ہوا تھا۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھانا چاہیئے اور یہ طے کیا کہ اس شاندار ریاست کی حدود میں پیدل چلنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم پیدل روانہ ہوئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے فوج اور ادھر ادھر خاموش مجمع کھڑا تھا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ منظر تھا جس کا میں عادی نہ تھا۔ ہم اس طرح ایک میل یا اس سے کچھ زیادہ دور تک گئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وقت کم تھا۔ اس لئے مجھے پھر موٹر میں بیٹھنا پڑا۔ اور پدو کوٹاہ کی فوج سے رخصت ہو کر ترچناپلی روانہ ہو گیا۔

یہ واقعہ بہت ہی معنی خیز ہے، اور اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کا کاروبار کیوں کر چلتا ہے۔ خصوصاً جب وہ انگریزوں کے ہاتھ میں ہوں۔ پدوکوٹاہ کا راجہ نابالغ ہے اور ریاست کا انتظام انگریز کر رہے ہیں۔ ریاست کی حدود سے میری کار بہت تیزی سے گزر رہی تھی اس لئے کہ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں خود کسی جگہ دم بھر بھی نہ ٹھہرتا۔ لیکن ریاست کے حکام کو خدا جانے کن کن واقعات کے پیش آنے کا اندیشہ تھا اور ان لوگوں نے وہ کیا جو

میں وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں کرسکتا تھا۔ یعنی ساری ریاست میں کھلبلی ڈال دی اور لوگوں کو میری طرف اور بھی زیادہ متوجہ کر دیا۔ میں اپنی طرف سے ریاست کے حکام کے اس فوجی انتظام کا جو اُنھوں نے میرے لئے کیا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ریاست نے ہار پہنانے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ ان کے نزدیک ہار پہنانا ایک انقلابی عمل ہے۔ اس سے تمام ریاست کے نظم و نسق کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ غالباً یہ نظم و نسق مکڑی کا جالا تھا۔ جو ہوا کے ایک ہی جھونکے میں اُڑ جاتا۔ اسی لئے اتنی بوکھلاہٹ تھی۔

۱۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء

کلکتہ

پانچ دن تک ہنگاموں اور مجمعوں میں گھرے رہنے کے بعد میں کلکتہ سے واپس چلا۔ لوگوں کے اُمید افزا اور دل بڑھانے والے جوابوں نے میری تکان دور کردی تھی۔ جب روح میں تازگی ہو تو جسم کی تھکاوٹ کچھ معنی نہیں رکھتی اور وہ خود ہی دور ہوجاتی ہے۔ کلکتہ کے اس قیام سے از سرِ نو مجھ میں ایک زندگی اور ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اس عظیم الشان شہر میں بہت سے پرانے ساتھیوں، بنگال کے اضلاع اور مزدوروں کے نمایندوں، نوجوان مردوں اور عورتوں اور دوسرے بہت سے مختلف الخیال لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اسی دوران میں مجھے بنگال پرونشیل کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا۔ ہمیں ایک مسئلہ کا حل نکالنا تھا جو کسی قدر الجھا ہوا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر غور کرتے وقت بھی اور دوسرے اہم مسائل کی بحث میں بھی میں نے یہی

اندازہ لگایا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے حد درجہ خواہش مند ہیں ؛ اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ آزادی کے اس بلند مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت ہمارے ملک کے سامنے نہایت اہم مسئلہ بنا ہوا ہے ۔ بنگال پراونشل کانگریس کمیٹی کا ایک متفقہ تجویز منظور کرنا ایک نہایت اطمینان بخش بات ہے ؛ اور میں اس کامیابی پر کمیٹی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔ اس سے بھی زیادہ میں اس جذبے سے متاثر ہوا جو اس فیصلے اور اُن مسائل میں کام کر رہا تھا جن پر اس فیصلہ کا اثر پڑتا تھا ۔ اس فیصلے سے نہایت واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ہمیں اپنی غلامی سے چھٹکارا پانے کے لئے معمولی اختلافات کو نظر انداز کر دینا چاہیئے ، اور ایک نہایت مضبوط اور اٹل متحدہ محاذ اس سامراج کے خلاف قائم کرنا چاہیئے جو ہمیں گھیرے ہوئے ہے اور ہماری روحوں کو کچل رہا ہے ۔ جس حد تک ہم اس حقیقت سے آشنا ہوں گے اور اپنے گرد وپیش کے مسائل کو سمجھیں گے اتنی ہی ہماری طاقت بڑھے گی اور اتنی ہی آئندہ ترقی کی اُمید ہو گی مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ بنگال نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا ہے ۔ وہ آزادی کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے ۔ ہندوستان کی آزادی کے مقصد کے حصول میں ساتھ دینے اور جنتا کو ظلم و تعدی کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے تیار ہیں ۔

یہ جذبہ نہ صرف کانگریس کے کارکنوں ہی میں پایا جاتا تھا بلکہ عام لوگوں میں بھی موجود تھا ۔ میری آمد پر جس طرح میرا شاندار استقبال کیا گیا اور جس کثرت سے لوگ ان مختلف جلسوں میں شریک ہوئے جن میں میں نے تقریریں کی تھیں ۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ بنگال کے

لوگوں کو کانگریس اور اس کی قوت پر اعتماد ہے۔ ہر ایک شخص میرے ساتھ جس گرمجوشی سے پیش آیا، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کا شکریہ ادا کر سکوں۔ میں اس کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ بنگالیوں پر جو جبر وتشدد ہوا ہے اس سے ان کی روح مردہ نہیں ہوئی اور نہ اُن کا ولولۂ آزادی سرد پڑا۔ اُن کی ناقابل تسخیر روح پر ظلم وجور برداشت کرنے کے بعد بھی سربلند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور فتح پائے گی۔ لیکن ہمیں اپنی قوت معمولی چیزوں میں ضائع نہ کرنی چاہیئے اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو چیز سب سے اہم ہے اُسے سب پر مقدم رہنا چاہیئے۔ ہندوستان میں سب سے اہم چیز ہندوستان کی آزادی اور یہاں کے کروڑوں آدمیوں کی افسوسناک غربت ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

میں اب واپس جا رہا ہوں لیکن میں اکثر بنگال کو یاد کرتا رہوں گا اور ہم لوگ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے بسنے والے بنگال کے لوگوں سے بڑے بڑے کارناموں کی توقع رکھیں گے۔ یہ جدائی محض عارضی ہے۔ اس لئے کہ ہم اکثر اس اہم مقصد کے لئے ملتے رہیں گے جس نے ہمیں ایک جگہ متحد کر دیا ہے۔

۹ نومبر ۱۹۳۶ء

کانگریس کی صدارت

جب سے میرا نام دوبارہ صدارت کے لئے پیش کیا گیا ہے اس وقت سے میں اسی کی فکر میں مبتلا ہوں اور بار بار اس معاملے پر غور کر رہا ہوں۔ یہ بات کچھ میرے جی کو نہیں لگتی۔ اس لئے کہ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ایک ہی شخص بار بار ایک عہدے پر کام کرے اگر میں صدر نہ بنوں تو بھی جو خدمت میں کرتا ہوں اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ بلکہ ممکن ہے کہ اور زیادہ خدمت کر سکوں۔ اس لئے کہ مجھے بہت سے اُن مقررہ کاموں کو پورا کرنے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ جن میں وقت بھی کافی صرف ہوتا ہے اور قوت بھی خرچ ہوتی ہے۔ جو بوجھ کانگریس کے صدر کو اُٹھانا پڑتا ہے وہ معمولی نہیں ہوتا۔ اور جو بہت سے کام اُسے کرنے پڑتے ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہوتے کہ کسی کو اس پر رشک آئے۔ کانگریس میں میرے اور بہت سے ساتھی اور رفقا رکار

لیسے موجود ہیں جو اس کام کے اہل ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات مناسب نہیں کہ میں اس عزت کی جگہ اور ذمہ داری کے عہدے کا ایک طرح سے اجارہ دار بن جاؤں۔ میں نے اس معاملے پر اپنے ساتھیوں سے گفتگو کی اور انھیں دوسرے نام پیش کرنے پر مجبور کیا۔ خان عبدالغفار خان کے نام پر خاص طور سے زور دیا۔ لیکن خاں صاحب اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھے اور دوسرے لوگوں نے بھی کچھ آمادگی ظاہر نہیں کی۔ میں نے یہ بات محسوس کی کہ مجھے مطلق انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی بعض وجوہ میرے انتخاب کے حق میں موجود تھے۔ میں ایک طرح کانگریس کے مختلف خیال کے لوگوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک حد تک میری وجہ سے ان کے آپس کے اختلافات دھیمے پڑ جاتے تھے اور یہ بات زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی کہ سامراج کے خلاف جنگ کرنے میں ہم سب متحد ہیں۔ اس لئے میں مذبذب تھا، نہ میں قطعی طور پر ہاں کر سکتا تھا اور نہ نہیں۔ چنانچہ میں خاموش رہا اور اس معاملے کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دیا۔

صدارت کے لئے نامزدگی کے فارم تیار ہو گئے ہیں اور انتخاب کا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب میں زیادہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ بلکہ مجھے اپنے ملک والوں کے سامنے اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ میرے رفقاء کار میں سے جس کسی کا بھی انتخاب ہوتا میں اُس سے بہت خوش ہوتا، اور جو اہم کام ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس میں بحیثیت ایک رکن اُن کا ہاتھ بٹاتا۔ مگر چونکہ میرے ملک کے لوگوں کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی ہے۔ اس لئے میں انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

میں اُن کی خوشی کو مقدم سمجھتا ہوں۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھے صدر بنانے کا فیصلہ کریں وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ میرے کیا اصول اور مقاصد ہیں۔ کن خیالات سے میں متاثر ہوتا ہوں اور میرے عمل کے لئے محرک کون سی چیز ہے اپنی تحریروں اور تقریروں میں میں اس بات کا کافی ذکر کر چکا ہوں میں چاہتا ہوں کہ انھی کی بنیاد پر میرے متعلق رائے قائم کی جائے۔ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اس لئے دھوکا کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔

جب میں پچھلے مارچ میں یورپ سے واپس آیا تو میں مدت سے سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھا۔ اور مجھے واقعات سے وہ عملی لگاؤ نہیں تھا جو سیاست میں دخل دینے والوں کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ روزمرہ کی تھکا دینے والی سیاسی زندگی سے علیحدہ رہ کر مجھے خاموشی سے سوچنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے میں نے اپنے ملک والوں کے سامنے کانگریس کے پچھلے اجلاس میں اپنے ان خیالات کے اظہار کی جرأت کی تھی۔

اس وقت سے برابر یہ آٹھ مہینے جلسوں اور جلوسوں میں گزرے اور میں واقعات کے انھی پرانے رشتوں کو سلجھانے میں مصروف ہوگیا ہوں، اور میں نے پھر وہی ہندوستان کی زندگی جس کے بہت سے پہلو ہیں اختیار کر لی ہے۔ اس دوران میں میں نے اپنے بہت سے ساتھیوں سے ملاقات کی۔ اپنے اس عظیم الشان ملک کے بہت بڑے حصہ میں گھوما اور اپنے دیس کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کے دلوں کو ٹٹولا اور اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے متعلق

کوئی رائے قائم کرسکوں۔ میں نے اس نقش کو پھر اُجاگر کر لیا جو مدھم ہو چلا تھا۔

اس مزید معلومات سے میرے ان خیالات میں جو میں نے لکھنؤ میں ظاہر کئے تھے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے یہ اور پختہ ہو گئے ہیں۔ دنیا اس وقت ایک نہایت زبردست کش مکش میں مبتلا ہے اور ہماری اپنی جد و جہد محض اس کا ایک حصّہ ہے۔ پرانا نظام ٹوٹ رہا ہے۔ سرمایہ داری اپنا مقصد پورا کر کے ہٹ رہی ہے اور سامراج جو سرمایہ داری کی سب سے نئی شکل ہے اپنے آپ کو قومیت اور اشتراکیت کی دستبرد سے بچانے کے لئے اپنے ارد گرد فصیل کھڑی کر رہا ہے۔ اس لئے کہ سامراج محض سرمایہ داری کی اس نئی شکل کا ایک مظہر ہے اور بغیر سرمایہ داری کی حقیقت کو جانے ہوئے جو مرکزی حیثیت رکھتی ہے اس کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ہندوستان میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہاں کے لوگوں کی افسوس ناک غربت، بے چارگی اور بے روزگاری ہے جس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس چیز سے سامراج کی موجودگی میں حقیقی نجات ممکن نہیں۔ ہم آزادی حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ لہذا سب سے مقدم سیاسی آزادی کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے کا معاشرتی مسائل سے بہت گہرا تعلق ہے اور اگر اس تعلق کو سمجھ لیا جائے تو ایک موثر قدم اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اور ایک صحیح جد و جہد کی ابتدا کی جا سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صرف اشتراکیت ہی کے ذریعے ہم اپنے معاشی مسائل کا حل نکال سکتے ہیں۔ لیکن اشتراکیت کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ہندوستان

سیاسی اعتبار سے آزاد ہو۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ خود سوراج کی جدوجہد میں اشتراکی تحلیل اس جدوجہد کی صحیح نوعیت سمجھنے میں ہمیں مدد دیتی ہے وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ دنیا کی ہمہ گیر جدوجہد سے اس کا کیا رشتہ ہے اور ہمیں کس قسم کے سوراج کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔

اس لئے آج ہندوستان کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ سامراج اور اُس کے تمام مظاہر کو نیچا دکھانا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں سامراج کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس محاذ میں وہ تمام عناصر اور لوگ شامل ہوں جو آزادی چاہتے ہیں۔ خواہ وہ جماعتی یا معاشی معاملات میں جدا جدا نقطۂ نظر رکھتے ہوں۔ اس مقصد میں اشتراکی یا غیر اشتراکی دونوں کو یکساں طور پر شامل ہونا چاہیے۔ کانگریس نے خود اس مشترک محاذ کے لئے ایک وسیع بنیاد ڈالی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسے قائم رکھیں۔ ہمیں اس محاذ کو توڑنا نہ چاہیے اس لئے کہ ہمیں طاقتور سامراجی اور رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے اگر کوئی اس محاذ کو کمزور کرتا ہے تو وہ اپنے لئے خطرہ مول لیتا ہے اور قوم کو نقصان پہنچاتا ہے۔

ہمارا کام اپنی قوتوں کو جمع کرنا اور جہاں تک ہو سکے اپنے اختلافات کے نقش کو ہلکا کرنا اور ایک دوسرے کی باتوں کو برداشت کرنا ہے، خواہ ہم بعض معاملات میں اختلاف رکھتے ہوں اس لئے کہ ہمارے اشتراک کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کی آزادی اور اس کا استقلال ہے۔ ہم پچھلے دنوں ایسا کر چکے ہیں اور ہم نے کانگریس کا یہ شاندار ڈھانچہ تیار کیا ہے ہم اب بھی اور آیندہ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ جو سامراج

کے خلاف اس متحدہ اور مضبوط محاذ کی بنیاد کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکتے ہیں اور اس عمارت کو اور اونچا اُٹھا سکتے ہیں۔

جو کام ہمیں فوراً کرنا ہے وہ جدید آئین اور اُس کے تمام کاموں کا مقابلہ ہے۔ کانگریس کے انتخابی منشور نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ اس آئین کے ساتھ تعاون نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا۔ ہم جو کچھ فیصلہ کر چکے ہیں اس سے قدم نہیں ہٹنا چاہیے بلکہ اُسے تکمیل تک پہنچانا چاہیے ہم اپنی پوری قوت کے ساتھ انتخابات کا مقابلہ کریں گے لیکن ہماری اس لڑائی میں اس مقصد کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ ہو گا اور ہم یہ بات یاد رکھیں گے کہ جد و جہد اور طاقت کا حقیقی وجود مجلس آئین ساز کے باہر ہے۔

یہ ہیں میرے موجودہ خیالات جو میں اپنے ملک والوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ وہ یہ سمجھ لیں کہ میرے ذہن میں کیا خیالات ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ بین الاقوامی کش مکش اور کسی وقت چھڑ جانے والی جنگ کا بھی معاملہ درپیش ہے۔ ہمیں اسے بھول نہ جانا چاہیے۔ اس لئے کہ ہماری قسمت اور ہمارا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء

خطبہ صدارت فیض پور نیشنل کانگریس

منعقدہ دسمبر ۱۹۳۶ء

ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے جب میں نے اسی صدارت کی کرسی سے آپ سے خطاب کیا تھا، اور آج پھر آپ کے حکم سے میں یہاں حاضر ہوں۔ آپ حضرات نے دوبارہ میری ذات پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا، میں اس کا ممنون ہوں - نیز اس محبت اور خلوص کا بھی بے حد معترف ہوں جو اس اظہار اعتماد میں شامل ہے - اس عزت اور ذمہ داری کے عہدے کے لئے آپ کا مجھے دوبارہ منتخب کرنا ایسا احسان ہے جس کے بوجھ سے میں دبا جاتا ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ میرا دل اس ذمہ داری کو اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہے - جو عورتیں اور مرد آج دنیا میں کسی ذمہ دار عہدے کے فرائض انجام دیتے ہیں - انھیں دراصل ایک بڑا سخت اور ناقابلِ رشک کام انجام دینا پڑتا ہے اور بہت سے تو اس کو سمیٹنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ ہندوستان

میں بھی کام اِسی طرح سخت اور تکلیف دہ ہے جس طرح کسی اور جگہ اور اگر موجودہ زمانہ مشکلوں سے بھرا ہوا ہے تو مستقبل کے پردے میں شاید اس سے بھی زیادہ مشکلیں اور زیادہ اُلجھے ہوئے مسائل پوشیدہ ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیئے اگر میں آپ کے اس گراں بہا عطیہ کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتا ہوں۔

قبل اس کے کہ ہم ان مسائل پر غور کریں جو ہمیں درپیش ہیں ہمیں اپنے ان ساتھیوں کا ذکر ضرور کرنا چاہیئے جو پچھلے چند مہینوں میں ہم سے جدا ہو گئے ہیں اور جو سالہا سال سے قید خانے اور نظر بندی میں پڑے گھل رہے ہیں اور نہ جانے کب تک اسی طرح گھلتے رہیں گے ——

ہمارے دو محبوب ترین رفیق ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عباس طیب جی اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان لوگوں نے وہ نام پایا جو کانگریس کی تاریخ میں عزت سے لیا جاتا ہے۔ دوست اور ساتھی کی حیثیت سے وہ سب کو عزیز تھے اور مشکل کے وقت عقل مند اور بہادر مشیر تھے۔

ہمارے جو ساتھی قید خانے میں ہیں یا نظر بند ہیں ہم اُنھیں دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ وہ مسلسل مشقتیں برداشت کر رہے ہیں اور اُن پر سختیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ ابھی حال میں ہم تین نظر بند قیدیوں کی خودکشی کی دل ہلا دینے والی خبریں سُن چکے ہیں۔ اُن کے لئے اپنے خوب صورت صوبے بنگال کی زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اس صوبے کے نوجوان مردوں اور عورتوں کی ایک کافی تعداد نہ ختم ہونے والی نظر بندی کی زندگی گذار رہی ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمیں دوسری جگہ بھی ملتے ہیں۔ نازی جرمنی میں نظر بندیوں کے کیمپ کا زور ہے اور

وہاں خودکشی عام ہے۔

کانگریس کے پچھلے اجلاس کے فوراً بعد مجھے مجلس عاملہ کے اراکین نامزد کرنے پڑے۔ میں نے اس میں اپنے ساتھی سبھاش چندربوس کا نام رکھا تھا۔ لیکن آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ بمبئی پہنچتے ہی کس طرح ہم سے جدا کر دیے گئے۔ اس وقت سے وہ نظر بند ہیں۔ حالانکہ ان کی صحت روز بروز گرتی جارہی ہے۔ ہماری کمیٹی ان کے مشوروں سے محروم رہ گئی اور مجھے تمام سال اپنے اس بہادر ساتھی کے نہ ہونے کا افسوس رہے گا۔ جن سے ہم کو بہت سی توقعات تھیں۔ بے بسی کے عالم میں ہم اپنے مردوں اور عورتوں پر یہ ظلم وستم دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ہماری آج کی یہ بے بسی ہمارے اس ارادے کو فولادی طاقت بخشتی ہے کہ ہم اپنی قوم کی یہ ناقابل برداشت حالت بدل کر رہیں گے۔

ہمارے ایک ساتھی جو لکھنؤ میں ہمارے ساتھ نہ تھے۔ عرصے کی نظر بندی اور قید سے رہائی پاکر واپس آگئے ہیں ہم خان عبدالغفار خاں کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور انھیں ان کی ذاتی شجاعت اور صوبہ سرحد کے لوگوں کی بہادری پر مبارک باد دیتے ہیں جن کی انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد میں نہایت مردانہ وار رہنمائی کی۔ اس وقت اگرچہ وہ ہمارے پاس نہیں لیکن ہندوستان کی برطانوی حکومت کا یہ فرمان ہے کہ وہ اپنے گھر واپس نہیں جا سکتے اور نہ اپنے صوبے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ پنجاب میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ ان کے صوبے میں ابھی تک کانگریس ایک غیر قانونی جماعت کی حیثیت رکھتی ہے اور بہت سی سیاسی سرگرمیاں ایسی ہیں جن کی وہاں ممانعت ہے۔

میں آپ حضرات کی طرف سے کامریڈ ایم۔ این رائے کا پرتپاک خیر مقدم کرتا ہوں۔ وہ اگرچہ نوجوان ہیں۔ لیکن ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک پُرانے اور آزمودہ کار سپاہی ہیں وہ ابھی ہمارے پاس جیل خانے سے رہائی پاکر چلے آرہے ہیں، جہاں وہ عرصہ تک قید کی سختیاں جھیلتے رہے۔ اس وقت اگرچہ وہ جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں لیکن دماغی اور روحانی اعتبار سے بالکل تازہ دم ہوکر آئے ہیں۔ اور اس پرانی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے بے چین ہیں۔ جو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کامیاب نہ ہوجائے۔

پچھلے چند مہینوں میں قدرتی حوادث نے غیر معمولی طور پر ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ بہت سے صوبے، قحط، طغیانی اور خشک سالی کے شکار ہوگئے اور ان کی وجہ سے ہماری قوم کے کروڑوں آدمیوں کو مصیبتوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ حال میں طوفان کی وجہ سے ضلع گنتھر میں جو جنوبی اضلاع میں سے ہے زبردست نقصان ہوا۔ ہزاروں آدمی وہاں کے بے خانماں ہوگئے اور ان کا گھر برباد ہوگیا۔ ہمیں اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ ابھی تک قدرتی حوادث انسان کے قابو سے باہر ہیں۔ لیکن آدمی کا دماغ اُن بار بار آنے والی طغیانیوں سے بچنے کی تدبیر نکال سکتا ہے۔ جن کے اسباب اُسے معلوم ہیں۔ اور خشک سالی اور اسی قسم کی دوسری مصیبتوں کے نتائج سے محفوظ رہنے کے لئے وہ ذخیرہ جمع کر سکتا ہے اور کوئی ایسا مناسب انتظام کر سکتا ہے کہ آسمانی بلاؤں کا شکار نہ ہوسکے۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں ہماری قسمتیں ہیں وہ اس سوجھ بوجھ سے محروم ہیں اور ہماری

قوم جو انتہائی مفلسی میں مبتلا رہتی ہے سوائے اس کے کہ مصیبت کے ہر حملے کے سامنے سر جھکا دے اور کچھ نہیں کر سکتی۔

آج کل ہم ہندوستان والے صوبجاتی انتخابات کی تیاریوں میں منہمک ہیں جو بہت جلد شروع ہونے والی ہیں۔ کانگریس نے ایک ہزار سے کچھ اوپر اُمیدوار اس کے لئے کھڑے کئے ہیں اور اس انتخاب کی مصروفیت نے ہمیں کئی طرح سے گھیر رکھا ہے۔ لیکن میں آپ سے پھر وہی درخواست کروں گا جو لکھنؤ میں کی تھی کہ ہمیں بیرونی دنیا کے خوفناک اور ہوش ربا ڈرامے پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ہماری قسمتیں اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں اور ہمارا انجام دوسرے ملکوں کے انجام کی طرح ان رقیب قوتوں اور حسد بھرے خیالات کے تصادم پر منحصر ہے جو ہر جگہ جڑ پکڑتے جا رہے ہیں۔ میں پھر آپ کو جتائے دیتا ہوں کہ ہماری قومی آزادی کا مسئلہ اور اسی طرح ہماری جماعتی آزادی کا مسئلہ دنیا کے اس بہت بڑے مسئلے کا محض ایک جزو ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے ہمیں دوسروں کو بھی سمجھنا ہوگا۔

اس آٹھ مہینے کے اندر اندر بین الاقوامی معاملات میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ حالت نازک ہوتی جاتی ہے۔ ترقی پذیر اور رجعت پسند قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرانے والی ہیں اور ہم نہایت تیزی سے جنگ کے غار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یورپ میں فاشیت کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کا لہجہ روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے اور بین الاقوامی معاملات میں کھلی ہوئی ڈکیتی کو رواج دے رہی ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد نفرت، تشدد اور جنگ کے

خرابیوں پر ہے اس لئے اگر اس کی وقت پر روک تھام نہ کی گئی تو لازمی طور پر وہ ساری دنیا کو جنگ میں مبتلا کردے گی۔ ہم ابی سینیا کو اس کا شکار ہوتے دیکھ چکے ہیں اور آج ہسپانیہ کی دردانگیز اور خوفناک حالت ہمارے سامنے ہے۔

فاشیت اس قدر ترقی کس طرح کر گئی کہ اب وہ یورپ اور تمام دنیا پر اپنی دھاک بٹھانے کا حوصلہ رکھتی ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے آدمی کو برطانیہ کی خارجی پالیسی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ پالیسی اگرچہ بظاہر بار بار بدلتی اور قدم قدم پر جھجکتی رہی ہے۔ لیکن اصل میں وہ برابر نازی جرمنی کی تائید کرتی رہی ہے۔ انگلستان اور جرمنی کے سمندری معاہدے نے فرانس کو اطالیہ کی طرف دھکیل دیا اور اسے موقع مل گیا کہ ابی سینیا کو ہڑپ کر جائے۔ اگرچہ آگے چل کر اطالیہ کے خلاف تعزیری کارروائی کرنے کا بہت کچھ چرچا رہا لیکن حقیقت میں برطانوی حکومت اطالیہ پر کوئی پابندی عائد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ جب ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ بطور سزا کے اٹلی کو تیل نہ بھیجا جائے تو برطانیہ نے اُسے منظور نہیں کیا۔ اور اطمینان سے بیٹھا ابی سینیا پر گولہ باری ہوتے اور مجلس اقوام کے اجتماعی تحفظ کے اصول کو ٹوٹتے دیکھتا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ برطانوی حکومت زبان سے برابر مجلس اقوام اور اجتماعی تحفظ کا نام لیتی رہی۔ لیکن اس کا عمل اس کے قول کو جھٹلاتا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ فاشیت کے حملے کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا جائے۔ نازی جرمنی نے پے در پے ایسی کارروائیاں کیں جس سے مجلس اقوام ذلیل ہوئی اور یورپ کا نظام

درہم برہم ہو گیا۔ اور برطانوی قومی حکومت ہمیشہ ہاتھ باندھے اس کے پیچھے چلتی رہی اور چپکے چپکے اُسے شاباش دیتی رہی۔

پھر ہسپانیہ کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ جمہوریت کے نام لیواؤں کی صریح اور آخری آزمائش تھی۔ ہسپانیہ کی جمہوری حکومت اس فاسستی فوجی بغاوت کے نرغے میں آگئی تھی جس کی امداد بیرونی فوجیں کر رہی تھیں۔ یہاں بھی فاشستی طاقتیں تو باغیوں کی امداد کر رہی تھیں اور مجلس اقوام کی رکن طاقتوں نے غیر جانب دار رہنے کی بے نتیجہ پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہاں کی جمہوری حکومت باغیوں کی دھمکیوں کا پوری طرح مقابلہ نہ کر سکے۔

غرض ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برطانوی سامراج کا میلان فاشستی طاقتوں کی طرف زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ اپنی پرانی عادت کے مطابق وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے جمہوریت ٹپکتی ہے اور ایسے لہجہ میں گفتگو کرتا ہے جس سے پارسائی کا اظہار ہوتا ہے۔ قول اور فعل کے اسی اختلاف کی وجہ سے برطانیہ کا وقار نہ صرف یورپ بلکہ دنیا میں گر گیا ہے اور کسی صدی میں بھی اس کی اتنی بے وقعتی نہ ہوئی ہو گی جتنی آج ہو گئی ہے۔

مختصر یہ کہ آج دنیا میں یہ دو بڑی طاقتیں اقتدار کے لئے لڑ رہی ہیں۔ ایک وہ جو جمہوری اور جماعتی آزادی کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہی ہے اور دوسری وہ جو اس آزادی کے خیال کو سامراج اور فاشیت کے پاؤں تلے روند دینا چاہتی ہے۔ اس جنگ میں برطانیہ

لازمی طور رجعت پسندی کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن وہاں کے باشندے یقیناً اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ جنگ نہایت سختی کے ساتھ اور نہایت واضح شکل میں آج ہسپانیہ میں جاری ہے۔ اور اس کے نتیجہ پر یہ بات منحصر ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا جنگ میں مبتلا ہو جائے گی یا اس کا امن قائم رہے گا۔ یا یوں کہئے کہ آیا فاشیت کو اقتدار حاصل ہو گا یا فاشیت اور سامراج دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس جنگ سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں، اور ان میں غالباً سب سے اہم سبق یہ ہے کہ جمہوری طریقۂ کار بنیادی مسائل حل کرنے اور دنیا کے حالات کے لحاظ سے معاشی اور جماعتی زندگی میں اہم تبدیلیاں پیدا کرنے میں ناکام ہے۔ اس ناکامی کا باعث وہ لوگ ہیں جو یہ تبدیلیاں چاہتے ہیں یا اُن کے لئے کام کرتے ہیں وہ تو جمہوری طریقے کو مانتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس طریقے سے مستقبل حقوق رکھنے والے اور اجارہ دار طبقوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے یہ طبقے جمہوری طریقۂ کار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت پر تل جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمہوریت کا مطلب ان کے اقتدار اور ان کے حقوق کا تحفظ ہے۔ جب جمہوریت اس میں ناکام رہتی ہے تو وہ لوگ اُسے بے کار سمجھتے ہیں اور اسے ختم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کوشش میں وہ کوئی بات اُٹھا نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ اپنی مخالف بیرونی طاقتوں سے بھی اتحاد کر لیتے ہیں۔ ایک طرف یہ لوگ اپنے آپ کو قوم پرور اور محب وطن کہتے ہیں اور دوسری طرف اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا خون بہانے اور اپنی قوم کو غلام بنانے کے لئے غیر ملکی فوجیں کرائے پر بلاتے ہیں۔

ہسپانیہ میں جو لڑائی آج لڑی جا رہی ہے وہ ہماری لڑائی ہے اور ہم نہ صرف اس دوستانہ ہمدردی سے اس جنگ کو دیکھ رہے ہیں جو کسی باہر کے رہنے والے کو ہو سکتی ہے بلکہ اس دل سوزی کے ساتھ گویا ہم خود اس میں شامل ہیں۔ ہم اپنی امیدوں کی کلیاں مرجھاتے دیکھ چکے ہیں اور اکثر اوقات ہسپانیہ کے مردوں اور عورتوں کی یہ خوفناک تباہی دیکھ کر ہم پر سخت مایوسی طاری ہو جاتی ہے لیکن ان انتہائی تاریک لمحوں میں وہ شعلہ جو ہسپانیہ کی آزادی کی اُمید دلاتا ہے زیادہ روشن ہو گیا ہے اور اس نے دنیا میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ بالآخر ہسپانیہ کی فتح ہو گی بے شمار مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اس مقصد کے لئے شہید ہو چکے ہیں کہ جمہوریت ہسپانیہ کی زندگی اور آزادی باقی رہے۔ ہم اور بہت سے ملکوں کی طرح ہسپانیہ میں بھی آزادی کے قلعوں کی دیواروں کو خوفناک طریقے سے برباد ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ وہ چھن چکے ہیں اور کتنی ہی مرتبہ واپس لے لئے گئے ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ وہ برباد ہو چکے ہیں اور کتنی ہی مرتبہ دوبارہ تعمیر ہوئے ہیں۔

میری خواہش ہے اور آپ میں سے اکثر لوگوں کی یہی خواہش ہو گی کہ ہم اپنے ہسپانوی ساتھیوں کی صرف ہمدردی ہی کرنے پر اکتفا نہ کریں۔ خواہ وہ ہمدردی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، بلکہ اُن کی مدد کریں۔ ہم تک ان مصیبت زدوں کی فریاد پہنچ چکی ہے اور ہم اس کے جواب میں خاموش نہیں رہ سکتے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی اس بے بسی کے عالم میں ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں ہم خود ایک

سامراجی طاقت کے خلاف جو ہمیں جکڑے ہوئے ہے اور کچل رہی ہے جنگ میں مصروف ہیں۔

بہرحال میں نے آپ لوگوں کو پہلے بھی یہی بتلایا تھا اور اب بھی یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ دنیا کے واقعات میں اعضائے جسمانی کی طرح تعلق ہے اور اُن کا ایک دوسرے پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اس طرح دیکھنے سے موجودہ دنیا کے الجھے ہوئے نقشے کو ہم تھوڑا بہت سمجھ لیں گے۔ اس میں ہمیں باوجود حیرت انگیز اختلافات کے یک رنگی ملے گی۔ مشرق بعید کی طرح یورپ والوں کو بھی مسلسل مصائب کا سامنا رہتا ہے۔ اور دنیا میں ہر جگہ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ فلسطین میں برطانوی سامراج کے خلاف عربوں کی جدوجہد اسی طرح اس عالمگیر کش مکش کا ایک حصہ ہے جس طرح ہماری آزادی کی جدوجہد۔ جمہوریت اور فاشیت، قومیت اور شہنشاہیت، اشتراکیت اور زوال پذیر سرمایہ داری۔ یہ سب کی سب ایک دوسرے سے خیالات کی دنیا میں اُلجھی رہتی ہیں۔ اور جب یہ تصادم مادی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس جدوجہد میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے ووٹ کی جگہ سنگینیں اور توپیں لے لیتی ہیں۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی اور سیاسی فکر ایک نیا رُخ اختیار کرلے۔ اور اگر یہ تبدیلی بہت جلد رونما نہیں ہوتی تو تصادم اور کش مکش کی نوبت پہنچتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ خیال انسانوں کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا کرتا ہے اور ذہن سے مادی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس تبدیلی میں جتنی تاخیر ہوتی ہے اتنا ہی یہ تصادم اور بڑھتا جاتا ہے۔ جب قوتوں کا موجودہ توازن

ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا توازن قائم نہیں ہوتا تو انحطاط اور مصیبت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مصیبت ہے جس کا ہمیں آج دنیا میں سامنا ہے اور ایک خوفناک پیمانے پر جنگ کے پھیل جانے کا امکان ہے۔ فاشستی طاقتوں کو چھوڑ کر ہر ملک اور ہر قوم اس جنگ سے خوف زدہ ہے۔ لیکن پھر بھی سب کے سب اس کی تیاری میں سرگرم ہیں اور اس تیاری میں یا تو ایک فریق کی طرف ہیں یا دوسرے کی طرف۔ جو لوگ بین بین رہنا چاہتے ہیں وہ یا تو بتدریج ختم ہوتے جا رہے ہیں یا شک و شبہ کی ماری ہوئی بے جسم روحوں کی طرح ادھر اُدھر منڈلاتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ پرانے لبرل ازم کا یہی انجام ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان میں جو لوگ اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں اور دوسرے لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں وہ اب تک اپنی خود اعتمادی کی خیالی دنیا میں مگن ہیں۔

"نئی خواہشوں کے ساتھ بڑھو۔
اس لئے کہ جہاں ہم اپنا آشیانہ بناتے تھے اور محبت
کے گیت گاتے تھے وہ زمین اب اُجڑ گئی۔ اب صرف
بھوت ہی وہاں رہ سکتے ہیں۔ دو بھڑکتے ہوئے
شعلوں کے درمیان"

یہ نئی خواہشیں کیا ہیں؟ ایک تو یہ کہ اس دیوانی دنیا کے اس نظام کو ختم کر دیا جائے جس سے جنگ اور کشمکش پھیلتی ہے اور جو کروڑوں انسانوں کو کچل ڈالتا ہے۔ دوسری یہ کہ غربت اور بے روزگاری نسدا کیا جلئے۔ اور جمہور کی سوتی ہوئی قوتوں کو جگایا جائے

اور انھیں انسانیت کی بہتری اور ترقی کے کاموں پر لگایا جائے۔ یعنی بجائے تباہی اور ہلاکت پھیلانے کے ہمیں تعمیر کرنی چاہیے۔ پچھلے آٹھ مہینوں میں میں نے اپنے اس وسیع ملک کے ایک بڑے حصے کا چکر لگایا ہے۔ اور ہندوستان کی عام آبادی کو اس مصیبت میں مبتلا پایا جس کو دیکھ کر آدمی کانپ اٹھتا ہے۔ ان کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ اس تکلیف دہ بوجھ سے جو انھیں اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ نجات حاصل کرنے کے لیے امداد کے طالب ہیں اصل مسئلہ ہمارا یہی ہے۔ باقی دوسری باتیں محض ضمنی ہیں۔ اور اسی مقصد کے ذریعے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہمیں سامراجی حکومت اور لوٹ مار کو ختم کرنا ہوگا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ آج کا سامراج کیا ہے؟ یہ محض ایک ملک کا دوسرے ملک کے لوگوں پر حکومت کرنا نہیں ہے۔ اُس کی جڑیں تو بہت گہری جاتی ہیں۔ موجودہ سامراج سرمایہ داری کی پیداوار ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اشتراکیت اور سرمایہ داری کے معنی کو سمجھے بغیر اپنے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ مرض جڑ پکڑ چکا ہے۔ اس میں تو کوئی انقلابی اور انتہا پسند تحریک کا نسخہ ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ اور وہ نسخہ جماعت کی اشتراکی تنظیم ہے۔ ہندوستان میں آج ہم اشتراکیت کے لئے نہیں لڑتے اس لئے کہ اس کے اصولوں پر عمل کرنے سے پہلے ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔ لیکن اشتراکیت کے اصول یہاں ہمیں اپنے مسئلے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اسے حل کرنے کا صحیح راستہ دکھاتے ہیں اور آنے والے سوراج کی حقیقت کو سمجھاتے ہیں مسئلہ

کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہمارے سارے کام اٹکل پچو، بے مقصد اور بے نتیجہ رہتے ہیں۔

آج کانگریس ہندوستان میں ملک جمہوریت کی حمایت کررہی ہے اور اشتراکیت کی بجائے جمہوری نظام حکومت کے لئے لڑ رہی ہے۔ وہ سامراج دشمن ہے اور ہماری معاشی اور سیاسی تنظیم میں اہم تبدیلیوں کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ واقعات کی زبردست رو سے خود اشتراکیت کی طرف لے جائے گی۔ اس لئے کہ میرے نزدیک اشتراکیت ہی ہندوستان کی بیماری کا علاج ہے۔ لیکن آج ہماری فوری اور اہم ضرورت سیاسی آزادی اور ایک جمہوری ریاست کا قیام ہے۔ اسی وجہ سے کانگریس کو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دینا چاہئے اور عالم گیر امن کی حمایت کرنی چاہئے۔ حال ہی میں یورپ میں تحریک امن نے ایک قابل ذکر قدم اٹھایا ہے۔ انجمن امن عالم کا ایک جلسہ پچھلے ستمبر میں برسلز کے مقام پر ہوا تھا۔ اس نے بہت سی انجمنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور قیام امن کی تدبیروں میں موثر طریقہ پر ان کی رہنمائی کی۔ آیا یہ کوشش جنگ کو دفع کرنے میں کامیاب ہوگی یا نہیں۔ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہم سب جو امن کو دوست رکھتے ہیں اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لئے دعا۔ شری وی۔کے کرشنا مینن نے برسلز میں ہماری کانگریس کی نمایندگی نہایت مناسب طریقے سے کی اور جو رپورٹ انھوں نے بھیجی تھی وہ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے مجھے یقین ہے کہ کانگریس خود امن کی اس مستقل تحریک میں شرکت کریگی

اور اس عظیم الشان کام میں اپنی پوری قوت سے مدد دے گی لیکن ایسا کرتے وقت ہمیں اپنے نقطۂ نظر کو بالکل صاف کر دینا چاہیے۔ ہمارے لئے اور ہم سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کے لئے امن کا مسئلہ سامراج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جنگ کے بنیادی اسباب کا تدارک کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ سامراج کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم عہد ناموں کا احترام کرتے ہیں لیکن ہم کسی ایسے عہد نامے کی پابندی کو اپنے اوپر فرض نہیں سمجھتے، جس کے کرنے میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہ ہو۔ ہاں اگر ہم انھیں بعد میں تسلیم کر لیں تو اور بات ہے۔ اپنی موجودہ حالت میں قیام امن کے مسئلہ کو جنگ کی مخالفت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ کانگریس نے پہلے ہی اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ ہم سامراجی جنگ کے شرکاء کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور ایسی جنگ میں ہم ہندوستانی فوجوں اور دوسرے وسائل سے فائدہ اُٹھانے کی ہرگز اجازت نہ دیں گے۔ اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

مجلس اقوام کی حالت نہایت ردی ہے چند ہی لوگ ایسے ہیں جو اسے سنجیدگی سے تحفظ امن کا ذریعہ سمجھتے ہیں ہندوستان کو اس سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہیں اور ہندوستان کی طرف سے لیگ کی رکنیت ایک ڈھونگ ہے۔ اس لئے کہ ہمارے نمائندوں کا انتخاب برطانوی حکومت کرتی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی مجلس قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو صحیح معنی میں بین الاقوامی مجلس ہو۔ اور جس کی تنظیم جمہوریت کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہو۔ اور جو حقیقی طور پر قوموں کی مجلس ہو۔ اگر اس موجودہ مجلس ہی سے جو بالکل بے دست و پا ہو رہی ہے اور

جس کا کوئی اثر باقی نہیں، امن کی حمایت کا کام لیا جا سکے تو ہم اس کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

اس بین الاقوامی پس منظر کو نظر میں رکھ کر ہمیں اپنے قومی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔ حکومتِ ہند کا ۱۹۳۵ء کا ایکٹ یعنی جدید دستور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دل شکن انداز میں ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ غلامی کا یہ نیا فرمان باوجود ہمارے ٹھکرا دینے کے زبردستی ہمارے سر منڈھا جا رہا ہے اور ہم اس کے ماتحت انتخابات لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں ہم اس انتخابی لڑائی میں کیوں شریک ہو رہے ہیں اور ہم کس طرح اس کو لڑیں گے۔ اس کے متعلق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انتخابی منشور میں پوری صراحت کر دی گئی ہے اور میں اسے آپ کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ہم مجالس قانون ساز میں اس لئے نہیں جائیں گے کہ حکومت کی کل چلانے میں برطانوی سامراج کا ہاتھ بٹائیں بلکہ اس ایکٹ کی مخالفت کریں گے اور اس کو ختم کرنے کی راہ نکالیں گے۔ نیز برطانوی سامراج کی اس کوشش میں کہ ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرے اور ہندوستانیوں سے خاطر خواہ نفع اٹھائے اس کی مزاحمت کریں گے۔ یہ ہے کانگریس کی بنیادی پالیسی۔ اور کسی کانگریسی کو اور اس انتخاب میں حصہ لینے والے کسی امیدوار کو یہ بات بھولنی نہ چاہیے۔ ہم جو کچھ بھی کریں، ہمیں اس پالیسی کی حدود کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہیے۔ ہم مجالس قانون ساز میں دستوریت یا بے نتیجہ صلاحیت کے طریقے پر چلنے کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔

ان انتخابات کے سلسلے میں مخالف پارٹیوں سے سمجھوتا کرنے کی طرف

کسی قدر رجحان پایا جا رہا ہے۔ اس سے مقصد اکثریت حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی قیمت پر بھی ملے۔ یہ رجحان بہت خطرناک ہے۔ اس کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ اس انتخاب سے یہ کام لینا چاہیئے کہ لوگوں کو کانگریس کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا کر دیا جائے۔ کانگریس کا پیغام ملک کے سب لوگوں کو خواہ وہ ووٹر ہوں یا نہ ہوں یکساں طور پر پہنچایا جائے اور عوام کی جدوجہد کو ابھارا جائے۔ اگر ہمارے عوام کی یہ تحریک نہیں ہے تو مجلس قانون ساز میں ہماری اکثریت بالکل بے کار ہے۔ اور جو اکثریت رجعت پسندوں یا افراد سے سمجھوتا کر کے حاصل کی جائے گی اس سے کانگریس کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس ایکٹ کے مقابلہ کے ساتھ ساتھ اور اس مقابلے کے ضمنی نتیجے کے طور پر ہمیں اپنے اس قطعی مطالبے کو منوانا ہے کہ وہ مجلس دستوری بنائی جائے جس کے انتخاب میں بلا قید ہر بالغ کو

رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ یہی بات آج کانگریس کی پالیسی کا سنگ بنیاد ہے۔ ہماری انتخاب کی لڑائی اسی پر مبنی ہونی چاہیئے اس مجلس کا تصور یہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ برطانوی حکومت کی قائم کی ہوئی ہوگی یا برطانوی سامراج کے ساتھ کسی سمجھوتے کا نتیجہ ہوگی۔ اگر وہ مجلس کوئی حقیقت رکھتی ہوگی تو اس کے پیچھے قوم کا ارادہ ہونا چاہیئے اور اُسے عوام کی منظم طاقت کی حمایت حاصل ہونی چاہیئے اسے اختیار حاصل ہو کہ وہ آزادی ہندوستان کے لئے دستور مرتب کر سکے ان انتخابات کے اور آگے چل کر اپنی دوسری سرگرمیوں کے ذریعے ہمیں عوام میں اس کی حمایت

کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔

ورکنگ کمیٹی نے اس کانگریس میں پیش کرنے کے لئے یہ تجویز مرتب کی ہے کہ مجالس قانون ساز کے تمام کانگریسی ارکان کا اور دوسرے لوگوں کا جنھیں کمیٹی شامل کرنا چاہے ایک اجتماع کیا جائے انتخابات کے فوراً بعد یہ لوگ ایک جلسہ کرکے دستوری مجلس کا مطالبہ پیش کریں اور یہ طے کریں کہ کس طرح ہر ممکن طریقے سے اس ایکٹ کی وفاقی تنظیم کے نفاذ کو روکا جائے۔ اس طرح کا ایک اجتماع جس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان بھی ضرور شریک ہوں گے۔ ہمیں اپنی جدو جہد کو ایک مرکز پر لاتے، اور مجالس قانون ساز کے اندر اور باہر اُسے ایک صحیح راستے پر چلنے میں بہت مدد دے گا۔ وہ مجالس قانون ساز کے کانگریسی اراکین میں صوبہ داری ذہنیت نہیں پیدا ہونے دے گا۔ اور انھیں صوبوں کے معمولی جھگڑوں میں اُلجھنے سے روکے گا۔ وہ اُنھیں یہ بتائے گا کہ ہر چیز کو صحیح تناسب سے دیکھنا چاہیئے۔ اور اُنھیں یہ احساس دلائے گا کہ وہ ایک ایسے نظم کے ماتحت ہیں جو سارے ملک پر حاوی ہے۔ نیز ایک بڑے پیمانے پر عوام کی سرگرمیوں کو بڑھانے میں اُن کو مدد دے گا۔ اس خیال میں بڑے بڑے امکانات موجود ہیں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ کانگریس اسے پسند کرے گی۔

دستوری مجلس کے مطالبہ کے ساتھ ہی ہمارا دوسرا اہم کام اس ایکٹ کی وفاقی تنظیم کی مخالفت کرنا ہے۔ یہ ایکٹ نہایت ہی ناقص ہے اور اس کا سب سے زیادہ ناقص پہلو یہ وفاق ہے۔

ہیں اس کو توڑنے کی ان تھک کوشش کرنی چاہیئے ۔ اس طرح اس تمام ایکٹ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نہ صرف برطانوی سامراج کی لوٹ کو سہنا بلکہ ہندوستانی جاگیرداری نظام کی ماتحتی قبول کرنا ایک ایسی بات ہے جسے ہم ہرگز قبول نہیں کرسکتے خواہ کچھ بھی ہو جائے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اس لمبے دور کا یہ ایک عجیب نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا تسلط اٹھا رہی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے ساتھ ہندوستان کے رجعت پسندوں اور ترقی کے دشمنوں کو ملا کر یہ کوشش کرتی ہے کہ ملک کی حکومت ایک حد تک جاگیرداری نظام کے ہاتھ میں دیدے۔

اس وفاقی اسکیم کا نشو ونما غور کرنے کے قابل ہے۔ ہم وفاق کے تصور کے خلاف نہیں یہ بہت ممکن ہے کہ آزاد ہندوستان وفاقی طرز حکومت اختیار کرے۔ اگرچہ بہر حال مرکزی حکومت کے ہاتھ میں بہت زیادہ اختیارات ہونا ضروری ہیں۔ لیکن موجودہ وفاق جو ہمارے سر زبردستی مڑھا جا رہا ہے ایک غلامانہ وفاق ہے۔ اور سیاسی اور جماعتی اعتبار سے اس پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہے جو ملک میں سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ موجودہ ہندوستانی ریاستیں انیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آئی تھیں۔ یہ برطانوی حکومت کا ابتدائی دور تھا اور اسے استقلال نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے مستبد حکمرانوں سے معاہدوں کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے جو ہمارے سامنے ایسی مقدس دستاویزات کی طرح پیش کئے جاتے ہیں جن کا ایک حرف بھی بدلا نہیں جا سکتا۔

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے یورپ کی حالت کا ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کیا جائے۔ اس وقت یورپ میں بہت سی حکومتیں اور بادشاہتیں تھیں۔ وہاں کے بادشاہ خود مختار ہوتے تھے اُن میں آپس میں عہد نامے تھے اور بادشاہوں کو اختیارات حاصل تھے۔ غلامی کو قانون نے جائز قرار دیا تھا۔ اس سو سال سے زیادہ عرصے میں یورپ کا نقشہ بالکل بدل گیا ہے۔ بہت سے انقلابات اور تبدیلیوں کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں ختم ہوگئیں۔ صرف چند بادشاہ رہ گئے ہیں۔ غلامی بالکل مٹ گئی ہے جدید صنعت و حرفت پھیل گئی ہے اور جمہوری ادارے بڑھ رہے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ووٹ کا حق مل رہا ہے۔ بعض ملکوں میں ان کا دور ختم ہوگیا اور ان کی جگہ فاشستی آمریت نے لے لی ہے۔ بھیڑی روس ایک ہی چھلانگ میں آگے بڑھ گیا ہے۔ اور اس نے ایک روسی اشتراکی ریاست قائم کرلی ہے اور ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر پہلو سے روز افزوں ترقی ہورہی ہے۔ دنیا بدلتی جا رہی ہے اور کوئی دن میں اس میں ایک اور زبردست تبدیلی ہونے والی ہے مگر ہماری ہندوستانی ریاستیں جوں کی توں ہیں اور ان ہر آن بدلنے والے حالات میں بھی اُسی جگہ قائم ہیں۔ اور اُن کا نقطۂ نظر وہی ہے جو انیسویں صدی کے ابتدا میں تھا۔ پرانے معاہدے واجب الاحترام سمجھے جاتے ہیں وہ معاہدے جو قوم یا اس کے نمائندوں سے نہیں بلکہ اس کے مستبد فرماں رواؤں سے کیے گئے ہیں۔

یہ ایسی صورتِ حال ہے جسے کوئی قوم اور کوئی ملک نہیں برداشت کرسکتا۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرسکتے کہ یہ پرانے معاہدے جنھیں سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اس قدر پائدار اور مستقل ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کو آزاد ہندوستان کی اسکیم میں حصہ لینے کے لئے اپنے آپ کو اس کے مطابق بنانا پڑے گا۔ کانگریس نے اعلان کیا ہے کہ ان ریاستوں کی رعایا کو وہی شخصی، شہری اور جمہوری آزادی حاصل ہوگی جو دوسرے ہندوستانیوں کو۔

اب تک ریاستوں کے ان معاہدوں یا اُن کے اقتدارِ اعلیٰ کا ذکر بہت کم سُننے میں آتا تھا۔ راجہ اور نواب سلطنت برطانیہ کے نظام حکومت میں اپنی صحیح جگہ پہچانتے تھے اور برطانوی حکومت ہمیشہ اُن سے سخت گیری کا برتاؤ کرتی تھی۔ لیکن ہندوستان کی قومی تحریک کی ترقی سے انھیں ایک جھوٹی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت نے ان پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنا شروع کردیا ہے تاکہ قومیت کو زک دینے میں وہ اس کی مدد کریں۔ اس زاویہ نگاہ کی تبدیلی اور اس کے ذریعے فائدہ اُٹھانے کے موقع کو والیان ریاست اور اُن کے وزراء فوراً بھانپ گئے۔ انھوں نے برطانوی حکومت اور ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور دونوں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور انھیں اس میں کامیابی ہوئی۔ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور وفاقی اسکیم میں اُنھیں غیر معمولی قوت حاصل ہوگئی ہے اپنی ریاستوں کی خودمختاری کو قائم رکھتے ہوئے جو باقی ہندوستان کی حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہے انھوں نے ہندوستان کے دوسرے

حصوں پر اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ وفاق میں شامل ہونے کے لئے اس طرح کی شرطیں پیش کرتے ہیں گویا وہ بالکل آزاد ہیں۔ یہاں تک کہ اس پر بھی گفتگو ہو رہی ہے کہ وہ وائسرائے کے ماتحت نہ رہیں۔ تاکہ یہ ریاستیں دنیا میں بے قید و بے لگام خود مختاری کے واحد نمونے رہ جائیں، جنھیں کسی آئینی باز پرس کا خطرہ نہ رہے بعض بڑی ریاستوں میں ایک شرارت آمیز کارروائی یہ ہو رہی ہے کہ وہاں کی فوج عمدہ طریقے سے مرتب کی جا رہی ہے۔

اس طرح دستورِ جدید کے وفاقی حصہ سے ہماری مخالفت محض نظری نہیں بلکہ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے، یہ ہماری آزادی کی جدوجہد اور ہمارے مستقبل کے انجام پر اثرانداز ہوتا ہے۔ ہم اُسے اپنی اس جدوجہد کا مرکزی نقطہ بتانے پر مجبور ہیں جو اس آئندہ کے خلاف جاری ہے ہم مجبور ہیں کہ اس وفاق کو توڑ ڈالیں۔

ہمارا کام اس ایکٹ کو ختم کرنے کے بعد نئے سرے سے دستور کے مسئلے کو حل کرنا ہے۔ ہمیں ان لوگوں نے، جن کی فکر صرف مجالس قانون ساز کی کارروائیوں تک محدود رہتی ہے۔ یہ بتلایا ہے کہ اس آئین کو توڑنا ممکن نہیں۔ باوجود اکثریت کی مخالفت کے حکومت اُسے کامیابی سے چلا سکتی ہے۔ اس کے لئے اس میں کافی تحفظات موجود ہیں۔ ہم ان تحفظات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ ہم اس ایکٹ کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری راہ میں مجالس قانون ساز کے ایوان اعلیٰ حائل ہیں۔ ہم ان مجالس

میں دستوری مشکلات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن سے کام رک جائے۔ ہم سامراجی مشین میں روڑے اٹکا سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حکومت کے لئے راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ یہ ایک محض مجالس قانون ساز میں مخالفانہ کارروائیاں کرنے سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اس کے لئے مجلسوں کے باہر عوام کی کوشش بھی ضروری ہیں۔ اور اسی لئے ہمیشہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری جنگ آزادی کا نچوڑ عوام کی تنظیم اور عوام کی جدوجہد ہے۔

مجالس قانون ساز کے بارے میں کانگریس کی پالیسی بالکل صاف ہے۔ صرف ایک معاملہ میں وہ اب تک مذبذب ہے۔ وہ عہدوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہے۔ غالباً اس سوال کے متعلق کوئی تصفیہ انتخابات کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لکھنؤ میں میں نے آپ سے یہ عرض کرنے کی جرأت کی تھی کہ میری رائے میں عہدوں کا قبول کرنا اس پالیسی کی تردید کرتا ہے جو ہم نے اس ایکٹ کو مسترد کرنے کے لئے اختیار کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ہماری سنہ ۱۹۲۰ء کی پالیسی کے بھی خلاف ہوگی۔ جس پر ہم اب تک عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ لکھنؤ کے اجلاس کے بعد کانگریس نے اپنے نظریے کی مزید وضاحت انتخابی منشور میں کی ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ ہم مجالس قانون ساز میں اس ایکٹ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کریں گے۔ بلکہ اس سے لڑیں گے۔ اس سے عہدوں کے قبول کرنے کے متعلق ہمارے فیصلے کی حدود کا تعین ہو جاتا ہے۔ جو لوگ عہدے قبول کرنے کی طرف مائل ہیں انہیں یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ یہ طریقہ اس ایکٹ سے عدم تعاون کرنے یا اسے

میرے نزدیک کانگریس کی پالیسی اور اس کی تعریف سے جو ہماری تجویزوں اور انتخابی منشور میں کی گئی ہے یہی منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ کانگریس کو وزارتوں اور عہدوں سے کوئی واسطہ نہیں، ان تجویزوں سے انحراف کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے کانگریس کی پالیسی کو بالکل الٹ دیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ہندوستانیوں کو لوٹنے میں برطانوی سامراج کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اور ایکٹ کے بنیادی تصورات کو قبول کر لیں گے خواہ وہ اعتراضات اور شرائط کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایک حد تک ہندوستان کے ترقی پذیر عناصر کو کچلنے کی قابل نفرت پالیسی میں حکومت کی معاونت کریں گے۔ اس کے سوا عہدوں کے قبول کرنے کی کوئی اور بنیاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر ہو بھی تو اس کا نتیجہ فوراً جمود اور تصادم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ہم اس جمود اور پیچیدگی کے پیدا ہو جانے سے نہیں ڈرتے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں ہمیں جمود پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے نہ کہ وزارتوں کا کام چلانے کی۔

ایک یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر ہم عہدے قبول نہ کریں تو دوسرے لوگ انھیں قبول کر لیں گے اور ہماری آزادی کی تحریک میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ لیکن اگر ہماری اکثریت ہو تو ہم دوسروں کی ان حرکتوں کو روک سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ سرے سے کوئی وزارت ہی نہ بننے دیں۔ لیکن اگر ہماری اکثریت مشکوک ہو تو پھر ہمیں عہدے کا ملنا اس پر منحصر ہے کہ ہم غیر کانگریسی عناصر سے سمجھوتہ کریں۔ یہ ایک پالیسی ہے جو ہمارے مقصد کے لئے نہایت

خطرناک ہے اور جو ہدایت کانگریس نے اس ایکٹ کو مسترد کرنے کیلئے دی ہے ہمارا عمل لازمی طور پر اس کے صریحی خلاف ہوگا۔ خواہ ہم اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں۔ ہمارے لئے اصل چیز یہ ہے کہ ہمیں منظم عوام کی تائید حاصل ہو۔ اس تائید کے بغیر کوئی اکثریت مجالسِ قانون ساز میں کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن ایک سرگرم اقلیت جسے اپنے حال سے باخبر اور منظم عوام کی تائید حاصل ہو اس ایکٹ کی راہ میں بڑی مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔

ہم نے دستوری مجالس کے مطالبے اور وفاقی تنظیم کے خلاف لڑائی کو اپنے پروگرام میں سب سے مقدم رکھا ہے اگر ہم عہدے کے سوال میں چکر کھاتے رہے اور اس کے جال میں پھنس کر رہ گئے تو ان دونوں اہم مطالبوں پر زور دینے اور ان کے لئے عوام کو احتجاج پر آمادہ کرنے میں ہم کون سی قوت سے کام لیں گے۔

نہایت اہم کام ہمارے سامنے ہے اور ہمیں ہندوستانی اور بین الاقوامی زندگی کے بڑے بڑے مسائل کا حل نکالنا ہے۔ ہمارے اس بڑے ادارے کے سوا ہندوستان میں اور کون ہے جو ان مسائل کا حل نکال سکتا ہو اور ان کا مقابلہ کر سکتا ہو؟ اس نے پچاس سال کی کوششوں اور قربانیوں سے ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کی نمائندگی کا وہ حق حاصل کر لیا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ ادارہ ہندوستانیوں کی امیدوں اور خواہشوں، ان کی آزادی کی لگن اور اس قوت کا آئینہ نہیں ہے جو ایک دن حکومت سے اس ... اس ادارے کا کام

چند جانباز بہادروں نے ایک چھوٹے سے پیمانے پر شروع کیا تھا لیکن اس وقت بھی یہ ایک تاریخی قوت کا حامل تھا۔ اس نے ہندوستانیوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ روز بروز اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا لیکن جب کبھی اس نے آگے بڑھنا چاہا تو اسے اندرونی کش مکش سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس کے بعض اراکین اس کی پیش قدمی کو روکتے رہے۔ لیکن یہ پیش قدمی کی خواہش نہایت شدید تھی۔ عوام کی طاقت اسے آگے دھکیل رہی تھی۔ چند لوگ جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ لیکن دوسرے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس میں آگئی اور کانگریس پروپیگنڈے کا بہت بڑا ذریعہ بن گئی۔ اور ہندوستان کے پبلک پلیٹ فارم پر چھا گئی۔ لیکن یہ ایک غیر مرتب مجمع تھا اور اس کا تنظیمی پہلو بہت کمزور تھا اور کسی بڑے پیمانے پر کوئی موثر قدم اٹھانا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ گاندھی جی کی شرکت سے بہت بڑی تعداد کسانوں کی کانگریس میں آگئی اور ان ہی کی تجویز کے مطابق کانگریس کا جدید دستور سنہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں مرتب کیا گیا جس سے ایک نظم قائم ہو گیا۔ آبادی کے تناسب سے نمائندوں کی تعداد معین ہو گئی۔ اور اس میں متحدہ اور موثر عملی جدوجہد کی قوت اور صلاحیت آگئی۔ یہ جدوجہد تھوڑے ہی دن کے بعد بہت بڑے پیمانے پر سارے ملک میں شروع ہو گئی اور بار بار ہوتی رہی۔ لیکن کانگریس کی اس عزت اور کامیابی نے اس میں اکثر ناپسندیدہ عناصر کو داخل ہونے کا موقع دیا اور اس کے دستور کی خرابی ظاہر ہو گئی۔ انجمن اتنی بڑھ گئی تھی کہ کام قابو میں نہیں رہا تھا اور اس نئے کام کی رفتار

سست پڑگئی تھی - اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ اپنے اپنے علاقوں میں چند مخصوص حلقے اُسے اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے تھے - دو سال ہوئے گاندھی جی کی تجویز پر دستور میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ممبروں کی تعداد کے لحاظ سے نمائندوں کی تعداد مقرر کی گئی ہے - یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جس سے ہمارے انتخابات میں ممبروں کی اصلی رائے کو زیادہ صحیح طریقے سے ظاہر کرسکتے ہیں - اور تنظیمی اعتبار سے ہماری قوت بڑھ گئی ہے - لیکن پھر بھی کانگریس کا جو وقار ہے اس کے لحاظ سے ہمارا تنظیمی پہلو بہت کم زور ہے - ہماری کمیٹیاں اکثر عوام سے بے تعلق ہوکر ہوائی کارروائیاں کرتی رہتی ہیں -

منجملہ اور باتوں کے ایک چیز یہ بھی تھی جس کو دور کرنے کے لئے لکھنؤ کانگریس نے عوام سے تعلق پیدا کرنے کی تجویز منظور کی تھی - لیکن افسوس جس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا اُس نے اب تک اپنی رپورٹ پیش نہیں کی - یہ مسئلہ صرف ان باتوں تک محدود نہیں جو تجویز میں مدنظر رکھی گئی ہیں - بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے - اس میں یہ بھی شامل ہے کہ کانگریس کے دستور کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے تاکہ یہ ایک زیادہ منظم جماعت بن جائے - اور اس میں ضبط اور موثر طریقے سے عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے - اس کے عمل کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ عمل عوام کا عمل ہو، کانگریس کی قوت کا نچوڑ یہی ہے کہ اس کی بنیاد عوام پر قائم ہو اور اُسے ان کا تعاون حاصل ہو - اس کی بنیاد عوام پر ضرور ہے - لیکن اس کی تنظیم میں اس کا خیال نہیں رکھا گیا - یہی ہماری سرگرمیوں کی بنیادی کمزوری ہے - ہم دیکھتے

ہیں کہ کانگریس جو اونچے طبقے کے لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی آہستہ آہستہ بدل کر نیچے درجے کے متوسط طبقے کے لوگوں کی اور بعد میں اس ملک کے عوام کی نمائندہ جماعت بن گئی۔ جوں جوں کانگریس کا رجحان عوام کی طرف بڑھا۔ اس انجمن کا سیاسی رُخ بھی بدلا اور بدل رہا ہے۔ اس لئے کہ سیاسی رُخ کا ایک بڑی حد تک تعین جماعت کی معاشی بنیادوں پر منحصر ہے۔

یہ تو ہم قطعی طور پر طے کر چکے ہیں کہ کانگریس کی بنیاد عوام پر رہے گی۔ اس لئے کہ اس کے بغیر ہم میں طاقت یا قوت نہیں پیدا ہو سکتی اب ہمیں اپنی تنظیم کو اس کے مطابق کرنا ہے تاکہ ہمارے عام ممبروں کو خود کام شروع کرنے اور ہمارے کام کی نگرانی کے زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں اور وہ کانگریس کی روزمرہ کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ہمیں کانگریس کو اور زیادہ جمہوری ادارہ بنانا چاہیے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے جس پر تمام سال بحث ہوتی رہی کہ کانگریس سے اور اداروں کا الحاق کر لینا چاہیئے مثلاً کسانوں مزدوروں اور دوسرے لوگوں کی انجمنیں جن کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کو آزادی دلانا ہے۔ اس طرح کانگریس ملک کی تمام سامراج دشمن طاقتوں کا وسیع ترین مشترکہ محاذ بن جائے گی۔ اس وقت بھی کانگریس میں براہِ راست اپنے زیادہ اراکین انھی جماعتوں سے حاصل کرتی ہے۔ غالباً اس کے ۷۵ فی صدی اراکین کسان ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیشوں کے لحاظ سے نمائندگی کی وجہ سے

کسانوں اور مزدوروں کو کانگریس میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہوجائے گی۔ مگر یہ تجویز اس اندیشہ کی بنا پر مسترد کردی گئی ہے کہ کہیں نئے عناصر کانگریس پر نہ چھا جائیں۔ اس لئے یہ عناصر بعض اوقات ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے بہت پیچھے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ یہ سوال ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ لیکن اس کے متعلق جو فیصلہ بھی ہو اس سے اس وقت کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوگا۔ اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ دوستی اور خیر خواہی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی بہت کم ایسی منظم انجمنیں ہیں جو کانگریس سے ملحق ہو کر فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کے کانگریس پر حاوی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اس کا نہایت آسانی سے تدارک کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اور آگے چل کر کانگریس میں پیشوں کے لحاظ سے نمائندگی نہایت ضروری اور مناسب ہے۔ کانگریس کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ وہ ایسے الحاق کے لئے کچھ شرائط مقرر کردے۔ تاکہ محض فرضی یا وقتی ناپسندیدہ انجمنیں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ جن انجمنوں کا الحاق کیا جائے ان کے نمائندوں کی تعداد بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں اسی قسم کی کچھ سفارشیں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بھیجی ہیں۔

ہمارا مقصد ملک کی تمام سامراج دشمن طاقتوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنا ہے۔ حقیقت میں خود کانگریس اسی قسم کا ایک متحدہ محاذ تھی۔ اور اب بھی ہے۔ اس لئے کانگریس ہی کو متحدہ عمل کی بنیاد اور مدار ہونا چاہیے۔ منظم مزدوروں اور کسانوں کے عمل اشتراک سے

اس محاذ کو اور تقویت حاصل ہو گی۔ اس لئے اس کا ضرور خیر مقدم کرنا چاہئے اُن کے اور کانگریس کے درمیان تعاون بڑھ رہا ہے، اور یہ تعاون گزشتہ زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رجحان کو تقویت پہنچانی چاہیئے۔ آج ہندوستان کی سب سے اہم اور فوری ضرورت یہی ہے کہ ملک کی ان تمام قوتوں اور عناصر کا متحدہ قومی محاذ بنایا جائے جو سامراج کے خلاف صف آرا ہیں۔ خود کانگریس میں ان میں سے اکثر قوتوں کے اکثر نمایندے موجود ہیں۔ اور باوجود مختلف اور گوناگوں نقطۂ نظر رکھنے کے وہ تعاون کرتے ہیں اور باہم مل کر بہبود عام کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ہماری عظیم الشان تحریک کی زندگی اور اندرونی اتحاد کی ایک اچھی علامت ہے۔ اس کی بنیاد سامراج کی مخالفت اور آزادی کی خواہش ہے اس کا فوری مطالبہ ایک دستوری مجلس عامہ ہے۔ جس کے ذریعے ایک جمہوری ریاست قائم کی جائے اور اس میں سیاسی قوت عوام کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ غیر ملکی فوج واپس بلالی جائے گی۔

یہ ہیں وہ مقاصد جو ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن ہم موجودہ حقائق اور ان مسائل کو جن سے آئے دن ہماری قوم کو سابقہ رہتا ہے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یہ اٹل حقائق ہمارے کروڑوں بھائیوں کی غربت اور بے روزگاری ہیں۔ خوفناک غربت اور بے روزگاری جس کے پنجے میں متوسط طبقے کے لوگ بھی گرفتار ہیں فالج کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ دولت اور افلاس کا تضاد نظر آتا ہے لیکن جیسا حیرت انگیز تضاد ہندوستان میں ہے وہ یقیناً کہیں نہیں ہو گا۔ ایک طرف

شاہی دہلی ہے برطانوی طاقت کا مظہر اور اس کی ٹیپ ٹاپ اور بے جا تکلفات اور دوسری طرف چند ہی میل کے فاصلے پر ہندوستان کے بھوکے کسانوں کی کچی جھونپڑیاں ہیں۔ ایک ریاست کا فرماں روا اپنی غریب اور مصیبت کی ماری رعایا کے سامنے اپنی دولت اور اپنے محلات کی نمائش کرتا ہے اور اپنے معاہدوں اور حق خود مختاری کی ڈینگیں مارتا ہے، اور یہ نیا ایکٹ اور یہ دستور اسی لئے ہمارے سر منڈھا گیا ہے کہ یہ تضاد دوامی اور مستحکم ہو جائے اور ہندوستان میں بے کھٹکے رشوتوں کے استبداد اور سامراج کی لوٹ جاری رہے۔

میں یہ خطبہ لکھ رہا ہوں اور اس وقت ایک ریلوے کے ملازموں میں بڑی ہڑتال جاری ہے عرصے ریلوے مزدوروں کی دنیا میں ہیجان پھیلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ تخفیف اور اُجرت میں کمی ہے۔ حکومت کی تمام قوت اُن کے خلاف استعمال کی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ گذرا بمبئی کے قریب امبرناتھ میچ فیکٹری میں جو ایک بڑے غیر ملکی ٹرسٹ کی ملکیت ہے نہایت زبردست ہڑتال ہوئی تھی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ اس ٹرسٹ کی حمایت اور پشت پناہی میں حکومت کے کل پُرزے نہایت غیر معمولی طور پر کام کر رہے تھے۔ ہمارے ملک میں مزدوروں کو ابھی تک ابتدائی حقوق حاصل کرنے باقی ہیں۔ اُنھیں ابھی اپنے کام کے لئے آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کرانا ہے اور بیمے کے ذریعے بے روزگاری کا تحفظ اور مزدوری کی ایک شرح مقرر کرانی ہے جو زندگی گذارنے کے لئے کافی ہو۔

لیکن اس سے بھی بڑا اور زیادہ ضروری مسئلہ کسانوں کا ہے۔ ہر

اور کانگریس کو کسانوں سے زیادہ قریب لانے کے لئے آج ہم اپنا جلسہ پہلے کی طرح کسی بڑے شہر میں نہیں بلکہ فیض پور کے گاؤں میں کر رہے ہیں۔ لکھنؤ کانگریس نے اسی زمین کے مسئلہ پر زور دیا تھا اور صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو اس بات کی ہدایت کی تھی کہ کاشتکاروں کے متعلق پروگرام مرتب کریں۔ یہ کام ابھی تک ناتمام ہے۔ اس لئے کہ اس مسئلہ کی وسعت کی وجہ سے پوری پوری تحقیق کی ضرورت ہے لیکن مسئلہ اس قدر ضروری ہے کہ اسے فوراً حل کرنا ہے۔ بہت سے صوبوں نے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ لگان اور مال گذاری کے قوانین میں بنیادی اصلاحات کی جائیں اور جاگیردارانہ طرز کا لگان ختم کر دیا جائے۔ قرضوں کے بوجھ نے زراعت پیشہ طبقوں کو کچل ڈالا ہے اور عام طور سے کسان یہ فریاد کر رہے ہیں کہ قرض کی وصولی ملتوی کی جائے اور اس کا ایک بڑا حصہ معاف کر دیا جائے۔ پنجاب میں قرض کمیٹیاں کسانوں کے تحفظ کے لئے قائم ہو رہی ہیں۔ یہ سب اور بہت سے مطالبات باصرار تمام پیش کئے جا رہے ہیں۔ اور کسانوں نے بڑے بڑے جلسے کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ اب ان میں اپنے موجودہ بوجھ کو اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ بغیر زمینداری کا پورا نظام بدلے محض جزوی کوششوں سے یہ پورا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہ نظام زمینداری اب زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ اور اصلاح کی صرف یہی تدبیر ہے کہ ریاست اور کاشتکاروں کے مابین جو درمیانی لوگ ہیں انھیں ختم کر دیا جائے اور کاشتکاری امدادِ باہمی یا اجتماعیت کے اصول پر ہو۔

نظام زمینداری کی اصلاح اس پر منحصر ہے کہ بڑے پیمانے کی

صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں دونوں کو ترقی ہو تاکہ ہمارے کروڑوں بے روزگار بھائی کام سے لگ جائیں۔ اور ہماری قوم کا افسوسناک معیارِ معیشت بلند ہو جائے۔ لیکن یہ چیز بہت سی دوسری چیزوں پر منحصر ہے۔ مثلاً تعلیم، رہائش کا انتظام، سڑکیں، باربرداری کی سہولتیں اصول حفظانِ صحت، طبی امداد اور رفاہِ عام کی صورتیں وغیرہ۔ حکومت کی معاشی اور مالی پالیسی کی وجہ سے صنعت و حرفت کی معقول ترقی ممکن نہیں ہندوستان میں شاہی ترجیح کے نام سے برطانوی مصنوعات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ شہر لندن کی دولت مندی کو منافع حاصل ہو۔ باوجود ہندوستانیوں کے مستقل احتجاج کے کرنسی میں وہی تناسب جاری ہے۔ ہندوستان سے سونا پانچ سال سے برابر ایک غیر معمولی شرح پر باہر بھیجا جا رہا ہے۔ حالانکہ تمام ہندوستان نہایت شدت سے اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ نیا ایکٹ ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس کے متعلق وائسرائے یا گورنر کو یہ خیال ہو کہ اس سے صرف برطانوی تجارت یا کاروبار کو نقصان پہنچانا مقصود ہے۔ پرانے قانون کی جگہ نیا قانون جاری ہو جانے پر بھی برطانوی مفاد محفوظ اور بے خطر رہتا ہے۔

اس طرح ایک مسئلہ دوسرے سے گتھا ہوا ہے اور یہ سب مل کر جس وسیع اور پیچیدہ مسئلہ کی شکل اختیار کرتے ہیں وہ موجودہ ہندوستان ہے کیا ہم ان لوگوں کی موجودگی میں جو اپنے مستقل حقوق کی خاطر ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور ہماری ترقی کو روکتے ہیں اس مسئلہ کا حل جزوی اور اوپری اصلاحوں سے کر سکتے ہیں؟ صرف ایک ہی صورت

ہے جس سے اس مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر سارے ملک کی اصلاح کا ایک نظام مرتب کیا جائے جو تمام قومی سرگرمیوں پر حاوی ہو اور ان میں باہم ربط پیدا کرے تاکہ ہر جزو کل میں کھپ جائے اور ساری قوم کے لئے مفید ہو۔ اگر اس سوچے سمجھے نظام کی پشت پر بصیرت اور ہمت موجود ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ لیکن یہ سوچا سمجھا نظام اجارہ داری، مستقل حقوق کی خواہش اور سامراج کی لوٹ کے ہوتے ہوئے نہیں پنپ سکتا۔ اس کے لئے ایسی فضا اور ایسی زمین کی ضرورت ہے جو سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے آزاد ہو۔

یہ منزلیں آج ہمیں بہت دور معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ واقعات کی تیز رفتاری ہمیں اپنے اندازے سے پہلے ہی وہاں پہنچا دے اولین منزل یعنی آزادی زیادہ قریب اور زیادہ واضح ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم بڑی حد تک اس المناک مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جس میں یورپ کے بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔

ہم بظاہر بہت کمزور نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہیں ہماری قوت بڑھ رہی ہے اور برطانوی سلطنت کا زور گھٹ رہا ہے ہمیں سیاسی اور معاشی اعتبار سے کچلا جاتا ہے۔ ہمارے حقوقِ شہریت پامال کئے جاتے ہیں۔ ہماری سینکڑوں انجمنیں غیر قانونی قرار دی جاتی ہیں۔ ہماری ہزاروں نوجوان عورتیں اور مرد بغیر قانون اور نظر بندی میں رکھے جاتے ہیں بے شمار خفیہ پولیس والوں اور جاسوسوں کے ذریعے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ہماری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قلم بند کر لئے جاتے ہیں کہ کہیں ان سے قانون بغاوت کی خلاف ورزی نہ

ہوتی ہو۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں ہیں کمزور نہیں بلکہ اور مضبوط کرتی ہیں۔ اس لئے کہ جبر و تشدد کی یہ زیادتی ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہماری قومی طاقت بڑھ رہی ہے۔ جنگ اور انقلاب کے بادل گرج رہے ہیں اور قومیں اندھا دھند مسلح ہو رہی ہیں۔ اگر جنگ چھڑ جائے یا کوئی اور نازک حال صورت پیدا ہو تو ہندوستان کے رویّے کا اس پر بہت کچھ اثر پڑے گا۔ کامیابی کی کنجی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس کا صحیح طرح سمجھانا شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قوت کی حقیقت کے اس بڑھتے ہوئے احساس نے ہماری قوم کی مغلوبانہ ذہنیت کو ختم کر دیا ہے۔

اس وقت ہم عام انتخابات میں منہمک ہیں اور ہماری قوت اسی پر صرف ہو رہی ہے۔ یہاں بھی ہمیں سرکاری مداخلت سے سابقہ پڑتا ہے گو حکومت اس سے انکار کرتی ہے۔ اس بات کی کوشش کی ہے کہ بے پڑھے لکھے رائے دہندے رازداری کے ساتھ رائے نہ دے سکیں کچھ مخفی رکھی ہے۔ یو۔پی کا صوبہ اس مقصد کے لئے خاص طور سے منتخب کیا گیا ہے اور رنگین صندوق جو دوسرے مقامات پر ہر جگہ استعمال کئے جائیں گے۔ یو۔پی میں اُڑا دئے گئے ہیں لیکن ہم باوجود ان مخالف قوتوں یعنی حکومت کے دباؤ مستقل حقوق رکھنے والوں کے اثرات اور اُن کی جہالت کے ان انتخابات میں کامیاب ہوں گے۔

یہ ہمارے لمبے سفر کا صرف ایک قدم ہوگا اور ہم خطرے اور مصیبت کی ہمراہی میں برابر بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ مدت

سے ہمارے رفیق ہیں اور ہم اُن کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جب
ہم اُن پر قابو پانا سیکھ لیں گے تو کامیابی کا راز ہم پر
کھل جائے گا۔

اشتراکیوں کے نام ایک پیغام

کامریڈ مسانی نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں آپ کی کانفرنس کے لئے کوئی پیغام دوں۔ میں خوشی سے یہ پیام تہنیت بھیجتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی کانفرنس کی کارروائی ہمارے اہم مقصد کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ آج یہ مقصد زیادہ بہتر طریقے سے یوں پورا ہو سکتا ہے کہ ملک میں سامراج کے خلاف ایک طاقتور متحدہ محاذ بنایا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ نیشنل کانگریس ہی صرف ایسی انجمن ہے جو اس متحدہ محاذ کا کام دے سکتی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے بہت زیادہ دلچسپی ہے کہ کل مسائل پر اشتراکیت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ اس لئے یہ ضروری

ل؎ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۶ء بمقام فیض پور ارسال کیا گیا۔

ہے کہ ہم ان اصولوں کو سمجھیں جن پر یہ نقطۂ نظر مبنی ہے۔ یہ بات ہمارے خیالات کو واضح کر دے گی اور ہماری سرگرمیوں کو بامقصد بنا دے گی۔ لیکن اس سوال کے دو پہلو مجھے قابلِ غور معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس نقطۂ نظر سے ہندوستان کے حالات کو سامنے رکھ کر کس طرح کام لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ ہندوستان کی زبان میں اشتراکیت کو کیسے ڈھالا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اگر ہم اپنی بات سمجھانا چاہتے ہیں تو ہمیں ملک کی زبان میں بولنا چاہیے میں محض ہندوستان کی مختلف زبانوں کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ میرا اشارہ زیادہ تر اس زبان کی طرف ہے جو دل اور دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زبان کی طرف ہے جو ماضی کی تاریخ، تہذیب اور موجودہ ماحول تینوں کی ترکیب سے بنتی ہے۔ جب تک ہم کسی ایسی زبان میں نہ بولیں جس میں ہندوستانی ذہنیت کی جھلک ہو اس وقت تک ہماری بات میں کچھ زیادہ زور نہیں ہوگا۔ محض ایسے لفظوں اور فقروں کا استعمال کرنا جو ممکن ہے کہ ہمارے لیے کوئی معنی رکھتے ہوں۔ مگر ہندوستان کے عوام میں رائج نہ ہوں اکثر بےکار ثابت ہوتا ہے۔ میرے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ اشتراکیت کو کس رنگ میں پیش کیا جائے۔ کس طرح ہندوستان کے حالات کے اعتبار سے اس کی تعبیر کی جائے اور کس طرح لوگوں کے دلوں تک اس کا امید افزا اور روح پرور پیغام پہنچایا جائے۔

یہ ایک سوال ہے جس پر میں چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کا حامی اچھی طرح غور کرے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء

دورے پر ایک نوٹ

نیشنل کانگریس کے صدر کو دورہ کرنے کا بھی اچھا خاصا کام رہتا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ لیکن دورہ کرنے میں جو مشکل پیش آتی ہے وہ زیادہ تر ملک کی وسعت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا سبب ہندوستان کے بہت بڑے دیہاتی رقبے میں اچھی سڑکوں کا نہ ہونا ہے۔ یہی دیہاتی رقبہ سب سے زیادہ توجہ کا مطالبہ بلکہ تقاضا کرتا ہے۔ عام انتخابات کی وجہ سے جن کی رو تمام ہندوستان میں پھیل گئی ہے۔ یہ بات اور بھی ضروری ہوگئی کہ بہت وسیع رقبہ کا دورہ کیا جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ مقامات پر پہنچنے کی کوشش کی جائے

اس دورے کا بہت سا حصہ انتخابات کے پہلے تین مہینوں میں فروری ۱۹۳۷ء تک پورا ہوا۔ انتخابات سے پہلے دورے کے ایام کی صحیح تعداد ۱۳۰ تھی۔ اس زمانے میں تقریباً پچاس ہزار میل کا دورہ کیا گیا۔ تقریباً

۲۶ ہزار میل ریل سے، کوئی ۲۲ ہزار پانسو میل سڑکوں سے (زیادہ تر موٹر کے ذریعے) اور ایک ہزار چھ سو میل ہوائی جہاز سے۔ اس میں طرح طرح کی سواریوں سے کام لیا گیا ——— ہوائی جہاز، ریل (عموماً تو تیسرے ہی درجے میں سفر کیا گیا بعض اوقات دوسرے درجے میں بیٹھنا پڑا اور دو موقعوں پر تھوڑی دیر کے لئے اسپیشل ٹرین بھی استعمال کی گئی) موٹر (رولس رائیس سے لے کر ۱۵ سال پہلے کی فورڈ تک) لاری، گھوڑا گاڑی، تانگہ، یکہ، بیل گاڑی، بائیسکل، ہاتھی، اونٹ گھوڑا، دخانی کشتی، چپو والی کشتی، ڈونگی۔ اور کبھی کبھی پیدل بھی چلنا پڑا۔

حسب ذیل کانگریسی صوبوں کا دورہ کیا گیا:۔

بمبئی، پنجاب، سندھ، دہلی، صوبجات متحدہ، اندھرا تامل ناڈ، ناگپور، مہاکوشل اور مہاراشٹر اکلکتہ، گیا مگر بنگال کے دوسرے حصوں میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ کارالا (مالابار) میں صرف کنا نورسے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ صرف گجرات، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، آسام، صوبہ جات متوسط کے کچھ حصے اور راجپوتانہ باقی رہ گیا۔

زیادہ تر دورہ دیہاتی علاقوں کا کیا گیا۔ اور ان جلسوں کو چھوڑ کر جن کا پہلے سے انتظام کیا جاتا تھا۔ بے شمار جلسے سرراہ وقت کے وقت ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک دن میں جلسوں کی تعداد بارہ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان میں سے بعض میں حاضرین تیس ہزار یا اس سے بھی زیادہ ہوتے تھے۔ بعض زبردست جلسوں میں حاضرین کی تعداد

ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔ جس جلسے میں پانچ ہزار کا مجمع ہو وہ ایک چھوٹا جلسہ سمجھا جاتا تھا۔ جلسوں میں شریک ہونیوالوں کی تعداد

روزانہ عام طور سے ایک لاکھ رہتی تھی بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔ بہت احتیاط کے ساتھ تخمینا کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن جلسوں میں میں نے تقریر کی اُن میں حاضرین کی مجموعی تعداد ایک کروڑ تک پہنچتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی لاکھوں آدمیوں سے مجھے سڑک کے سفر کے دوران میں کسی نہ کسی طرح کا سابقہ پڑا۔ عموماً حاضرین کے ان بڑے بڑے گروہوں میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی تھی۔

ان اعداد و شمار میں نہ تو وہ لوگ شامل ہیں جو فیض پور کانگریس میں شریک ہوئے اور نہ وہ دورے شامل ہیں۔ (جیسے برما اور ملایا) جو فروری ۱۹۳۷ء کے بعد کئے گئے۔

دوروں کی اس کثرت کے لئے بہت بڑے عمل کی اور نہایت عمدہ انتظام کی ضرورت ہوتی تھی۔ بہرحال انتظام مناسب تھا لیکن اتنا زیادہ کام کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ۲۴ گھنٹے کے مختصر سے دن میں وہ پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر روز صبح تڑکے پروگرام شروع کیا جاتا تھا اور رات کو بہت دیر تک چلتا رہتا تھا۔ ۱۸ گھنٹے یا اس سے کچھ زیادہ صرف ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ۱۳ سے ۱۴ فروری تک مسلسل تمام دن اور تمام رات ۲۴ گھنٹے چلنے پھرنے اور جلسوں میں تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اس کے بعد ہی دوسرے دن کا پروگرام شروع ہوگیا۔

الیکشن کے پیغامات

بہار

سات دن تک میں نہایت تیزی سے بہار کا دورہ کرتا رہا اور تیر کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ کر کانگریس کا پیغام پہنچاتا تھا ان سات دن میں میں نے اس صوبے کا ایک سرے سے دوسرے سرے یعنی بالکل نیپال کی سرحد تک چکر لگایا۔ دیہاتی رقبے میں غربت کے مارے کسانوں کے بڑے بڑے جلسوں میں شریک ہوا۔ پرانے شہروں میں سے گذرا جو تاریخی اور روایتی شہرت کے مالک ہیں۔ نئے شہروں میں گیا جہاں صنعت، تجارت، بے روزگاری اور ریلوے ہڑتالیں دیکھنے میں آتے تھے۔ فولاد کی کانوں والے شہر جمشید پور میں پہنچا اور کالے کوئلے کے علاقے جھریا سے ہو کر گذرا۔ چھوٹا ناگپور کے خوب صورت جنگلات، اور اس کے قدیم باشندوں کو جو جنگلی کہلاتے ہیں دیکھتا ہوا تیزی سے گذر گیا۔ ہر جگہ کانگریس کے پیغام کا پرجوش

طریقے سے جواب ملا۔ اور لوگ میرے ساتھ بے انتہا محبت اور مہربانی سے پیش آئے۔ میں افسوس کے ساتھ اس صوبے سے رخصت ہوتا ہوں لیکن اپنے ساتھ یہاں کے رہنے والوں کی پر خلوص محبّت کی یاد جو خوشبو کی طرح میرے دماغ میں مہکتی رہے گی لئے جا رہا ہوں اس سے مجھے آنے والے خطروں میں تقویت اور تازگی حاصل ہوگی۔ بہار کے رہنے والے مردو اور عورتو۔ زبردست اور شاندار مہم میں عزیز ساتھیو میں دعا کرتا ہوں کہ تم خوش رہو اور تمھیں ہمت اور استقلال نصیب ہو۔

جنوری ۱۹۳۷ء

صوبجاتِ متحدہ

(۱)

میں صوبہ جات متحدہ کے اضلاع کا دورہ ختم کر چکا ہوں اور اب میں جنوب میں مہاراشٹر اور کرناٹک کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں۔ پچھلے مہینوں اور ہفتوں میں میں نے اپنے صوبے کے قریب قریب اڑتالیس ضلعوں کا چکر لگا لیا ہے۔ میں اپنی قوم کے اس حیرت انگیز جوش و خروش کے اظہار سے نہایت مسرور اور مطمئن [illegible] ہو رہا ہوں۔ گاؤں اور شہر دونوں جگہ کانگریس کا نام جادو کا اثر رکھتا ہے۔ کانگریس ہمارے کروڑوں آدمیوں کے لئے جائے پناہ اور ان کی امید کا مرکز بن گئی ہے ہمارے حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے جنگی رسالے زیادہ عرصے تک ہمارے کروڑوں آدمیوں کو مغلوب نہیں رکھ سکتے۔ وہ غلامی کی لمبی راتوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ انھوں نے نسیم سحری کی ہلکی سی رمق محسوس کر لی ہے۔ اس لئے کانگریس کے پناہ دینے والے اور زندگی پیدا کرنے

والے جھنڈے کے نیچے ہم فتح مندی کی طرف بڑھ رہے ہیں اس وقت ہمیں انتخابات کا مقابلہ کرنا ہے۔ کل یا پرسوں لوگ رائے دینے کے لئے جائیں گے۔ ہر مرد اور ہر عورت کو ملک کی حمایت کا فرض ادا کرنا چاہیے اور کانگریس کو ووٹ دینا چاہیئے۔ اس طرح ہمارا آزادی کا فیصلہ آہنیں ہاتھوں سے لکھا جائے گا۔

۶ فروری ۱۹۳۷ء

(۲)

صوبجات متحدہ کے ساتھیو میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں اور کرناٹک
جیسے دور دراز مقام سے تمھاری کامیابی کی خوشی میں شریک ہوں - ہم
انتخابات میں نہایت شاندار طریقے سے کامیاب ہوئے ہیں، ہم جانتے
تھے کہ ویسا ہی ہوگا - لیکن جیت کس کی ہوئی؟ نہ تو شخصی طور پر ہمارے
اُمیدواروں کی اور نہ ہم کانگریس کے کارکنوں اور سپاہیوں کی
جنھوں نے اس کامیابی کے لئے محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں. بلکہ
یہ اس بڑی انجمن کی جیت ہے جسے کانگریس کہتے ہیں جس نے ہمیں پروان
چڑھایا ہے اور ہمارے کروڑوں مصیبت کے ماروں کے دلوں میں امید
کی ایک چنگاری روشن کر دی ہے - اس سے بھی بڑھ کر یہ کامیابی
جمہور کی ہے جو انھیں ہر قسم کی زبردستیوں، دھمکیوں، زیادتیوں
اور ترغیبوں کے باوجود حاصل ہوئی - میں نے سنا ہے کہ جب گاؤں کے

لوگ ایک مرتب جلوس کی شکل میں قومی جھنڈے کے ساتھ دور دراز مقامات سے چل کر پولنگ اسٹیشن کی طرف جاتے اور متحد ہوکر کانگریس کے اُمیدوارو کو رائے دیتے تو عجب شاندار اور روح پرور منظر ہوتا تھا۔ انھوں نے ہماری آواز سنی اور کانگریس کے پیغام پر دھیان دیا اور نہایت شاندار طریقے سے اس پر لبیک کہا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح صوبجات متحدہ بھی نئے ایکٹ کو مکمل طور پر مسترد کر دینے کی حمایت میں ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ عوام نے کانگریس کو رائے دی۔ اور یہ سمجھتے ہوئے رائے دی کہ کانگریس ان کے مفاد کی حمایت اور ان کے لئے کام کرتی ہے۔ اور وہی ان کی صحیح نمایندہ جماعت ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں۔ اور اپنی کشتی کے اس لنگر کو نہ چھوڑیں صرف یہی چیز ہمیں اصل کامیابی تک پہنچائے گی اور ہمیں اپنی قوم کے سامنے سرخرو کرے گی۔ اس کے علاوہ ہر چیز ہمیں اپنے مقصد سے گمراہ کردے گی۔ اور ان اُمیدوں پر پانی پھیر دے گی جو ہم نے اپنی قوم کے کروڑوں آدمیوں کو دلائی ہیں، یو۔پی، بہار اور دوسرے مقامات کے انتخاب میں جو سبق ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم سیدھے عوام کے پاس گئے اور اُن سے ایسی سادی اور صاف زبان میں گفتگو کی جسے وہ سمجھ سکتے تھے وہیں کے لوگوں نے خوشی خوشی اور دل وجاں سے ہماری موافقت میں اپنے ووٹ دئے۔ جہاں ہم کمزور رہے اور سمجھوتے کا طریقہ اختیار کیا۔ وہاں ہمیں مقابلتہً کم کامیابی ہوئی۔ ہمارے سب سے زیادہ کامیاب اُمیدوار وہ کانگریسی کارکن تھے جن کا کوئی شخصی اثر یا رسوخ نہ تھا۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم

اس کامیابی پر غور نہ کریں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اس کامیابی کا سہرا عوام کے سر ہے۔ یو، پی، بہار اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگوں نے برطانوی سامراج کو ہندوستان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی، گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک اُن کی پیروی کریں گے اور ایسے ہی پرزور نوٹس دیں گے۔ سامراج کا وقت قریب آگیا ہے۔ قوم نے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے اور اس کے قتل کا فتویٰ دیدیا ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اس فتوے پر عمل کریں اور آگے بھی عوام کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ انتخابات کا کام جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اہم کام جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ابھی باقی ہے اس کے لئے اب ہمیں اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیئے۔ ہم پورے بھروسے کے ساتھ اس آخری کامیابی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

۱۲ فروری ۱۹۴۶ء

جنوبی اور مغربی ہند کے لوگوں کے نام

اپنے لمبے لمبے سفر ختم کرنے کے بعد میں شمال کی طرف واپس ہوتا ہوں۔ میں اس لئے واپس جاتا ہوں کہ سوراج کے اس لمبے سفر کے لئے تیاری کروں جس کا یہ سفر ایک قدم تھا۔ میں کانگریس کا پیغام جنوبی اور مغربی علاقوں کے لئے لے کر آیا تھا۔ آپ لوگوں نے وہ پیغام نہ صرف میری کمزور آواز کے ذریعے سنا۔ بلکہ شمال کے ان بے شمار انسانوں کے ذریعے سنا جو کانگریس کی پکار پر جوق جوق چلے آتے ہیں۔ اور آزادی کے لئے جن کے گرجتے ہوئے نعرے ہندوستان کے وسیع میدانوں، وادیوں اور پہاڑوں میں گونجتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دلوں نے ان نعروں کا کیا جواب دیا؟ کیا جمہور کی یہ دل ہلا دینے والی صدا سن کر آپ لوگوں کی رگوں میں خون نہیں کھولتا؟ ہندوستان آپ کے اپنے دلیرانہ جواب کا منتظر ہے۔ اور وہ خوب

اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ جواب کیا ہوگا۔ رجعت پسندوں اور آزادی کے دشمنوں کا خاتمہ کردو۔ کانگریس کے ساتھ صف آرا ہوجاؤ۔ آجاؤ آجاؤ، ہم سب مل کر سوراج کی طرف قدم اُٹھائیں۔ کس کی مجال ہے کہ اس آواز پر توجہ نہ کرے۔

فروری ۱۹۳۷ء

خطبہ صدارت آل انڈیا کنونشن

منعقدۂ دہلی ۔ مارچ ۱۹۳۷ء

ہم اس بات کے عادی ہوگئے ہیں کہ ہمارے کانگریس کے جلسے وسیع، شاندار اور ہندوستانی قوم کے آزادی کے ارادے کی نمائندگی کرنے والے ہوں۔ وہ ہمارے ملک کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ، ترقی اور تبدیلی کی روایات اور نئی ضرورتوں اور نئے موقعوں سے سازگاری کا آئینہ ہوتے ہیں۔ لیکن آج ہمارا اس کنونشن میں جمع ہونا ایک جداگانہ نوعیت لئے ہوئے ہے۔ اس لئے کہ اس کنونشن کا کوئی پس منظر نہیں، سوائے اس کے جو ہم اس کے لئے پسند کریں، اور کوئی مستقبل نہیں سوائے اس کے جو ہم طے کردیں۔ مستحکم ادارے اور انجمنیں رفتہ رفتہ ایک خاص ارادہ اور ایک خاص معیار حرکت حاصل کرلیتی ہیں۔ جس کی بدولت وہ خودبخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس میں اُن کے ارکان کی خواہش شامل ہے یا نہیں۔ اُن کی ایک انفرادیت ہوتی ہے

جو اپنے آپ کو اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ یعنی اس کے مقصد میں خاص استحکام اور پختگی ہوتی ہے اور اسی طرح ایک حد تک قدامت پسندی بھی۔ وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ ہاتھی کی طرح اُن کا جنبش کرنا مشکل ہے۔ لیکن اگر اُن میں حرکت پیدا ہوجائے تو پھر وہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور دنیا کی حالت بدل دیتی ہے۔ انھی میں سے ہماری کانگریس بھی ہے۔

لیکن یہ کنونشن ایک نئی چیز ہے۔ چند ہی لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے اور آگے چل کر کیا ہوگی۔ ایک حد تک یہ شک بجا ہے۔ لیکن ہم سب لوگ اچھی طرح اپنی منزل اور اپنے مقصد کو جانتے ہیں۔ اگرچہ یہ کنونشن بالکل نیا ہے۔ لیکن اس کی اساس اُسی گذشتہ جدوجہد پر ہے جو کانگریس اور ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں درج ہوچکی ہے۔ کنونشن اصل میں کانگریس کا بچہ ہے، اور اپنی قوت اور رہنمائی کے لئے اس کا محتاج ہے۔

اس خطبے کو لکھتے وقت مجھے ایک مشکل درپیش ہے۔ اس لئے کہ بعض باتوں کے متعلق میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان چند دنوں میں جو اس گھڑی اور کنونشن کے جلسے کی تاریخ کے درمیان آئیں گے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہمارے بہت سے اہم مسائل کا فیصلہ کرے گی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ لیکن جب یہ لکھا ہوا پیغام زبان پر آئے گا تو اس وقت تک بہت کچھ ہوچکا ہوگا۔ جس کی وجہ سے شاید اس میں کسی تبدیلی کی یا کسی خاص بات پر زور دینے کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن بہرحال تبدیلی جو کچھ بھی ہو ہمارے سامنے کانگریس کی

پالیسی اور پروگرام، اس کی متعدد تجویزوں اور ہمارے انتخابی منشور کے مطابق واضح اور متعین ہے۔ ہمیں اسی دائرے کے اندر رہنا چاہیئے اس سے باہر نکلنے کی کوشش اس پالیسی اور اس بڑے مقصد سے غداری ہوگی جس کے لئے کانگریس کھڑی ہے۔ آپ میں سے جو حضرات نئی مجلس قانون ساز کے لئے منتخب ہوئے ہیں۔ انھوں نے لوگوں کی رائے کانگریس کے انتخابی منشور کی بنیاد پر حاصل کی ہے۔ انھیں لازمی طور پر اس کی پابندی کرنی چاہیئے۔ عوام نے اس پالیسی اور پروگرام کو جس طرح سراہا اس کی زندہ شہادت آپ کی کامیابی کی وہ عظمت ہے جو اُسے رائے شماری میں حاصل ہوئی۔ کروڑوں آدمیوں نے اس بات کی تصدیق کردی کہ انھیں اس پر پورا یقین اور بھروسہ ہے اور اس بات کی سند دے دی کہ ہندوستانی قوم اُسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔

رائے دینے والوں کی تعداد ہماری قوم کی تعداد کی نسبت صرف ۱۰ فی صدی تھی۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جتنے زیادہ غریب لوگوں میں جائیں اتنے ہی کانگریس کے حامی زیادہ ملیں گے بقیہ ۹۰ فی صدی ان ۱۰ فی صدی سے بھی زیادہ ہماری حمایت میں ہیں جنھوں نے ہماری پشت پناہی کی ہے۔ اگرچہ ہماری کامیابی نہایت شاندار ہوئی۔ اور اس نے ہمارے مخالفوں کو پریشان کردیا اور سرمایہ داروں کے نمائندوں کو جو ہمارے مدمقابل تھے ختم کردیا۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انتخابات کا یہ سارا ڈھونگ ایسا رکھا گیا ہے کہ ہم کمزور ہوجائیں۔ ہمارے خلاف جابرا ور قومی حکومت کا دباؤ استعمال کیا

گیا۔ اور اس کے پیچھے وہ تمام رجعت پسند اور ظلمت پرست لوگ صف آرار تھے جو سامراج کے سایۂ عاطفت میں پرورش پلتے ہیں تاہم ہم نہایت دھوم دھام سے اس میں کامیاب ہوئے۔

صرف مسلم نشستوں کے معاملے میں ہم کامیاب نہ ہوسکے لیکن اس موقع پر اس ناکامی ہی نے ہمیں یہ بتادیا کہ کامیابی ہمیں نہایت آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ عام مسلمان زیادہ سے زیادہ کانگریس کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اس لئے ناکام ہوئے کہ ہم نے عرصے سے مسلم عوام میں کام کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور نہ ہم ان کے پاس وقت پر پہنچ سکے۔ لیکن جہاں ہم پہنچے، خصوصاً دیہاتی علاقوں میں۔ ہم نے تقریباً وہاں وہی جوش پایا۔ دوسروں کی طرح ان میں بھی وہی سامراج دشمن روح موجود تھی۔ ہندو، مسلم، سکھ کسانوں سے بات چیت کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ جس کا ہم اتنا شور سنتے ہیں۔ کہیں وجود ہی نہیں رکھتا۔ ہم اس وجہ سے بھی مسلمانوں میں ناکام رہے کہ ان کے یہاں رائے دینے والوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ جنھیں آسانی سے سرمایہ داروں اور حکام نے بہلا پھسلا کر یا زبردستی ہموار کرلیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے باوجود بھی اگر ہم زیادہ توجہ مسلم عوام کی طرف کرتے تو ہمیں زیادہ کامیابی حاصل ہوتی۔ وہ عرصے سے تغافل کا شکار ہیں اور ان کی غلط رہنمائی ہورہی ہے۔ حالانکہ ان پر خاص توجہ کی ضرورت ہے مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اپنی بے شمار مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے کانگریس کی طرف متوجہ ہورہے ہیں اور مستقبل میں ان کا تعاون حاصل ہوجانا

یقینی ہے۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح طریقے سے پہنچا جائے اور معاشی مسائل پر اُن سے گفتگو کی جائے۔

ہم مدتوں سے فرقوں کے لیڈروں کے درمیان صلح اور سمجھوتے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں لیکن عوام جو اُن کے پیچھے ہیں۔ ہم نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ پالیسی فرسودہ ہو چکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ یہ پالیسی اختیار نہ کریں گے۔ ابھی تک بعض لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا دونوں کو الگ الگ مذہبی فرقوں کی حیثیت سے آپس میں نمٹنا ہے۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کا خیال ہے جس کے لئے اس موجودہ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ آج ہمیں معاشی نزول سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور غربت، بے روزگاری، قومی آزادی کے مسائل، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں میں مشترک ہیں۔ جس قدر جلد ہم ان لیڈروں سے کنارہ کشی اختیار کریں گے جو ہر وقت مجلس قانون ساز کی نشستوں اور سرکاری ملازمتوں کی فی صدی تعداد کا رونا روتے رہتے ہیں، اور عوام کے نزدیک آئیں گے۔ اسی قدر جلد ہم ان مسائل پر قابو پانے میں کامیاب ہوں گے۔ اس صورت سے اس چیز کا خاتمہ ہو جائے گا جسے عرصے سے لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ سمجھتے آئے ہیں۔

اس زمانے میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ہندوستان کے مسلم عوام اور روشن خیال مسلمانوں کا رجحان ہے۔ بغیر کسی موثر رہنمائی کے وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے ہیں انھیں اپنی اس بے چارگی کی حالت پر غصہ آتا ہے اور باوجود اس کے جو اُن کے متعلق

خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک سامراجی حکومت سے جو انھیں قومی تحریک سے الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے معمولی اور حقیر فائدہ اٹھایا ہے، وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ اس فرقہ دارانہ رہنمائی نے انھیں سیاسی اعتبار سے کم زور کردیا ہے۔ بوڑھے اور نوجوان، مسلمان اور مسلم اخبارات سب کے سب اسی تجزیہ ذات میں منہمک ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ خواہش جڑ پکڑتی جا رہی ہے کہ وہ اس فرقہ بندی سے نکل کر آزادی اور ترقی چاہنے والی طاقتوں کے ساتھ صف آرا ہوں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح کانگریس کی رد ہندوؤں کی فرقہ بندی کو بہالے گئی ہے۔ کس طرح اس نے عوام کی فکر پر قابو پا لیا ہے اور وہ اپنے آپ کو ذرا اُداس اور الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو کامیابی آج حاصل ہوئی ہے اور جو کل حاصل ہوگی اس میں وہ بھی شریک ہوں اور اس سلسلے میں جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں بھی حصہ لینے کے لئے وہ تیار رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری انتخابات کی مہم مسلمانوں کے لحاظ سے بھی کامیاب رہی۔ اگرچہ عموماً ہم مسلم نشستیں حاصل نہیں کرسکے۔ اس مہم نے ایک حد تک فرقہ پرستی کا بھوت اُتار دیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ آگے بڑھ کر ہم مسلم عوام اور روشن خیال مسلمانوں کا خیر مقدم کریں اور انھیں اپنی اس بڑی انجمن میں شامل کریں۔ اور ملک کو ہر قسم کی فرقہ پرستی سے نجات دلائیں۔

ان انتخابات سے ہمیں بہت سے سبق ملے ہیں لیکن ان میں سب سے نمایاں یہ واقعہ کہ جہاں ہم سیدھے عوام کے پاس گئے۔ وہیں ہمیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ بعض صوبوں میں ہماری ناکامی کی

ایک وجہ بالکل کانگریس کی تنظیم ہے کہ وہ صرف شہروں تک محدود رہی اور کسانوں سے بہت کم تعلق رکھا۔ ہمیں اس کمی کو دور کرنا چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ زبان استعمال کرنی چاہیے جو عوام سمجھتے ہوں اور اپنی پالیسی کو ایسا بنانا چاہیے کہ وہ ان کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ ہمیں کانگریس کی تحریک ہر گاؤں میں پھیلانی چاہیے اور ہر کچی جھونپڑی میں کانگریس کا پیغام لے کر پہنچنا چاہیے۔

میں نے اپنی جماعت کی بعض کوتاہیوں اور بعض ناکامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اچھا یہ ہے کہ ہم انھیں یاد رکھیں اور اپنی کامیابی کے زعم میں آکر انھیں بھول نہ جائیں۔ ہم اپنی عمارت مستقبل کے لئے اٹھا رہے ہیں۔ ہماری بنیادیں مضبوط اور صحیح ہونی چاہئیں کوئی الیکشن جیت لینا ہمارے لئے فخر کی بات نہیں۔ ہم تو اپنی قوم کے لئے آزادی کی لڑائی جیتنے نکلے ہیں۔

ان ناکامیوں کا ذکر کرنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اس کامیابی کے متعلق بھی کچھ کہوں جو ہمیں حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ یہ زبردست کامیابی ہمارے لئے تو تعجب انگیز نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اپنی قوم کی حالت سے واقف ہیں۔ البتہ ہمارے مخالفین کو ہکا بکا اور پریشان کر دینے والی ضرور رہی ہے یہ ہیں ان انتخابات کی ممتاز خصوصیات۔ حکومت نے کس قدر احتیاط اور شفقت سے ہندوستان کے مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی پرداخت اور فرقہ پرستوں اور بڑے بڑے زمینداروں کی ہمت افزائی کی اور انھیں منظم کر کے ہماری مخالفت کے لئے کھڑا کیا، اور نہایت اطمینان سے اپنی اس ناپاک کوشش کی کامیابی کا انتظار کرتی رہی، مگر آج کہاں ہیں

وہ سامراج کو سہارا دینے والے اور ہندوستانی قوم کو لوٹنے والے ؟ وہ ڈوب گئے ، کوئی نشان بھی اُن کا قریب قریب باقی نہیں ۔ وہ ہندوستان کے انسانیت پرور سمندر کی تذر ہوگئے ۔ ہندوستانی عوام کا زبردست ریلا انھیں سیاست کے میدان سے ڈھکیل لے گیا ۔ مٹی کے گھروندے کی طرح حقیقت کے ایک ہی اشارے میں بیٹھ گئے ۔ وہ لوگ بھی اس طرح مٹ جائیں گے جو ہندوستان کی آزادی کی مخالفت کرتے ہیں ۔ ایک دن آئے گا جب برطانوی سامراج ہمارے قوم کا اور زیادہ گلا نہ گھونٹ سکے گا اور نہ اُنھیں کچل سکے گا ۔ اور اس کا وجود ہمارے لئے ماضی کا ایک خواب بن کر رہ جائے گا ۔

ہم اپنی قوم کے پاس گئے اور انھیں آزادی اور لوٹ مار کے خاتمہ کا پیغام سنایا ۔ ہم اس فراموش کی ہوئی مخلوق کے پاس گئے جسے ہندوستانی کسان کہتے ہیں ۔ اس کی حالت نے ہمیں یاد دلایا کہ ہندوستان کا بنیادی مسئلہ کسان کی غربت ہے ۔ ہم نے اُسے بتلایا کہ ہم بھی اس مصیبت میں اُس کے شریک ہیں اور اسے بتایا کہ ہم کس طرح سیاسی اور جماعتی آزادی کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرسکتے ہیں ۔ ہم نے اس کو سامراج ۔ اس نئے ایکٹ اور اس دستور کا مطلب سمجھایا جس نے ہمیں پہلے سے بھی زیادہ زنجیروں میں جکڑ دیا ہے ۔ اور جسے ہم ختم کرنے اور اس کی جگہ ایک پنچایتی راج قائم کرنے کے لئے نکلے ہیں ۔ یہ پنچایتی راج دستوری مجلس یعنی بہت بڑی قومی پنچایت ہے جسے ہماری قوم منتخب کرے گی اُسے ہم نے اپنا انتخابی منشور پڑھ کر سنایا اور اس کی خاص خاص باتوں کی اس کے سامنے تشریح کی ۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے

جو بہت بڑی تعداد میں جمع تھے ہماری بات سُنی اور کانگریس کا پیغام سُن کر اُس کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اُٹھیں اور جوش و خروش کے عالم میں اِس کا جھرّیاں پڑا فاقوں کا مارا جسم تن گیا۔ اور اُمید شراب بن کر اُس کی رگوں میں دوڑنے لگی۔ کیا کوئی شخص جس نے یہ منظر دیکھا ہے وہ اُسے بھول سکتا ہے۔ یا بعد کا وہ نظارہ جب ہزاروں آدمی ایک باقاعدہ قطار میں قدم بڑھاتے پولنگ اسٹیشن کی طرف چلے جاتے تھے۔ نہ انھیں مخالفین کی دھمکیوں اور دباؤ کی پرواتھی اور نہ مفت کی سواریوں اور مفت کے کھانوں کا لالچ۔ وہ اُسے جاتر سے کم نہیں سمجھتے تھے کہ کانگریس کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کریں اور نئے دستور کا خاتمہ کرنے اور پنچائتی راج قائم کرنے کے لئے ووٹ دیں۔ جس کی بدولت خود انھیں یہ طاقت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اپنے افلاس کو دور کر دیں۔

یہ ہے اہمیت اس الیکشن کی۔ اگر جمہوریت کوئی معنی رکھتی ہے، اگر ووٹنگ اور الیکشن کی اس مہنگی اور پیچیدہ مشین کی تیاریوں میں سمجھ بوجھ سے کام لیا گیا ہے اور یہ محض بے ربط اور بے جوڑ پرزوں کا ایک مجموعہ نہیں ہے تو ہندوستانی قوم نے پکار پکار کر کہہ دیا کہ وہ اس دستور کو ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ اس نے برطانوی سامراج کو نوٹس دے دیا ہے کہ وہ ہندوستان خالی کر دے۔ لہٰذا اس دستور کو ایک سرے سے منسوخ کر دینا چاہئے۔ اور اس کی جگہ دستوری مجلس قائم کرنی چاہیے۔

ہم مجالس قانون ساز میں اپنی پالیسی کے متعلق گفتگو اور بحث کرتے ہیں۔ لیکن یہ ساری گفت و شنید عبث اور بے سود ہے۔ بنیادی

حقیقت یہ ہے کہ اس دستور کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ ہندوستانی قوم کا یہی فیصلہ ہے اور ہم اپنی قوم کے جھوٹے اور بے وفا نمائندے ہوں گے اگر ہم یہ بات بھلا دیں اور جو تاکیدی ہدایت ہمیں ملی ہے اس کے خلاف کریں۔

مجھے معلوم ہے کہ ہم میں ایسے عناصر موجود ہیں جو ان بنیادی باتوں سے چشم پوشی کرنے کے بے حد مشتاق ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عہدوں کے لئے بیتاب ہیں اور قبل اس کے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی عہدوں کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی فیصلہ کرتی۔ ان لوگوں نے حکومت سے وزارتوں کے متعلق بات چیت کی جس سے کانگریس اور ہمارے اہم مقصد کے وقار کو نقصان پہنچا ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں اُن کے خیالات جو بھی ہوں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس کے متعلق کچھ بھی فیصلہ کرے۔ میں یہ بات اُن لوگوں کے ذہن نشیں کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر اس شخص کا جو کانگریسی کہلانے کا مستحق ہے اور مجلس قانون ساز کے ہر کانگریسی کا طرز عمل ہمیشہ وہی ہونا چاہیئے جو ہمارے مقصد اور ہماری انجمن کے ضبط اور وقار کے لئے موزوں ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ لوگ انتخابی منشور اور کانگریس کی تجویز کو اپنے سامنے رکھیں جن کی بنیاد پر انھوں نے لوگوں سے ووٹ مانگے تھے۔ کسی کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ہم مجالس قانون ساز میں برطانوی سامراج سے کسی قسم کا بھی تعاون کرنے نہیں گئے ہیں، بلکہ ہمارا مقصد اس سے لڑنا اور اس ایکٹ کو ختم کرنا ہے جو ہمیں جکڑتا ہے اور ہمیں غلام بناتا ہے۔ کسی شخص کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

یہ آزادی کیا ہے؟ ایک واضح، معین اور بولتا ہوا لفظ ہے تمام دنیا اس کے معنی سمجھتی ہے۔ اس میں ابہام کا کوئی امکان نہیں لیکن ہماری بدقسمتی سے یہی لفظ نادیوں کا تختہ مشق ہو گیا۔ ہمیں اس کے صحیح معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ آزادی کے معنی ہیں قومی آزادی۔ یہی اس لفظ کا کلی مفہوم ہے۔ ہم نے جو عہد کیا ہے اس کے مطابق اس کے معنی ہیں برطانیہ سے قطع تعلق۔ اس کے معنی ہیں سامراج دشمنی اور سلطنت سے لڑائی۔ ہمیں لفظوں میں الجھایا جاتا ہے۔ کبھی ہم سے ڈومینین اسٹیٹس کا ذکر کیا جاتا ہے، کبھی آئین ویسٹ منسٹر کا، کبھی دولت مشترکہ برطانیہ کا اور ہم ان الفاظ کے معنی پر جھگڑتے رہتے ہیں۔ حقیقی دولت مشترکہ مجھے تو کہیں نظر آتی نہیں البتہ ایک سلطنت ہے جو ہندوستانی قوم اور دنیا کے مختلف حصوں میں اور بہت سی قوموں کو لوٹ کھسوٹ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوٹ مار کی اس بھیانک مشین سے جو ایشیا اور افریقہ میں چل رہی ہے۔ میرے ملک کو کسی قسم کا واسطہ نہ رہے۔ اگر یہ مشین ہٹا دی جائے تو پھر ہمیں کوئی شکایت نہ رہے گی۔ بلکہ ہم انگلستان کے بہی خواہ ہوں گے اور ہر وقت اس کے خواہش مند رہیں گے کہ برطانوی قوم کے عوام کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں۔

ڈومینین اسٹیٹس ایک ایسی اصطلاح ہے جو خاص حالات کے ماتحت وضع کی گئی تھی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس کا مفہوم بدلتا گیا۔ برطانوی قوموں میں اس سے مراد ایک مخصوص مقتدر جماعت ہے جو اپنی متعدد ماتحت قوموں کو لوٹتی ہے۔ آئین ویسٹ منسٹر سے ممکن ہے کہ یورپی مقتدر جماعت کے ممبروں کے آپس کے تعلقات میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔

لیکن حاکم و محکوم کا وہ فرق بدستور باقی ہے۔ یہی جماعت برطانوی سامراج کی نمائندگی کرتی ہے اور آج دنیا میں اس کا کام اُسی نظام اور رجعت پسند قوتوں کی حمایت ہے جن کے خلاف ہم لڑ رہے ہیں۔ بھلا ایسی صورت میں ہم کیسے برضا و رغبت اس نظام اور ان قوتوں کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ کیا لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر ہم میں صلاحیت دیکھی گئی تو یہ ممکن ہے کہ ہمیں آہستہ آہستہ ترقی دے کر ماتحت جماعت سے صاحبِ اقتدار جماعت بنا دیا جائے گا؟ لیکن سامراجی تار و پود اور اُن کی تمام بنیاد کم و بیش وہی رہے گی جو آج ہے۔ یہ ایک عبث خیال ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اگر بالفرض یہ بات ممکن بھی ہو تو ہمیں اسے قبول نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ پھر ہم دوسروں کو لوٹنے میں سامراج کے شریک ہو جائیں گے اور ان دوسروں میں ہماری قوم کے بھی بہت سے لوگ شامل ہوں گے۔

یہ کہا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی اس خیال کے حامل ہیں کہ اگر ہمیں قومی آزادی مل گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی سامراج ہندوستان میں باقی نہ رہے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ خود برطانوی سامراج ختم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم کیوں اپنا تعلق برطانیہ سے قائم نہ رکھیں۔ یہ دلیل نہایت قوی ہے کہ ہماری لڑائی برطانیہ یا برطانوی قوم کے ساتھ نہیں بلکہ برطانوی سامراج کے ساتھ ہے۔ لیکن جب ہم اس طرح اس کے متعلق سوچتے ہیں تو ایک اور وسیع اور مختلف دنیا ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے اور ڈومینین سٹیٹس اور آئین ویسٹ منسٹر تقویم پارینہ بن جاتے ہیں۔ اس وسیع دنیا کو برطانوی

ملی جماعت سے بحث نہیں بلکہ اُسے ایک ایسی جماعت سے بحث ہے جس میں تمام دنیا کی قومیں شامل ہوں اور جس کی اساس سیاسی اور جماعتی آزادی پر ہو۔

اس لئے ڈومینین سٹیٹس خواہ وہ وسیع ترین معنی میں ہو اور اس میں یہ حق بھی شامل ہو کہ ہم جب چاہیں اپنے آپ کو علیحدہ کرلیں ہم کو ایک محدود جماعت بنا دے گا۔ اور اس صورت میں یہ ضروری ہو گا کہ وہ دوسری جماعتوں کی مخالفت کرے اور دوسری جماعتیں اُس کے خلاف کھڑی ہوں اور اس کی بنیاد لازمی طور پر موجودہ روبہ تنزل نظام جماعت پر ہوگی۔ اس لئے ہم ڈومینین سٹیٹس کے اس خیال سے خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو اپنا دل نہیں بہلا سکتے۔ ہم جو چیز چاہتے ہیں وہ آزادی ہے ہمیں کسی خاص سٹیٹس کی ضرورت نہیں مذکورہ نظام ایسا ہے کہ اس کے پردے میں برطانوی سامراج کی نیش زنی باقی رہتی ہے خواہ باہر سے دیکھنے میں اس کا ڈھانچہ کتنا ہی خوش نما معلوم ہو۔

لہذا ہمیں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے اور ہمیں ان تھک کوشش کرنی چاہیئے کہ برطانیہ سے ہمارا تعلق باقی نہ رہے۔ لیکن ہمیں یہاں دوبارہ اس کی وضاحت کردینی چاہیئے کہ آج وسطی یورپ میں آزادی سے جو مفہوم لیا جاتا ہے ہم وہ نہیں سمجھتے۔ ہم نہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننے کے قائل ہیں اور نہ کسی ایسی قومیت کے جو لڑائی پر تلی رہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام ترقی یافتہ ملکوں سے ہمارے بہت گہرے تعلقات قائم ہوں گے انگلستان سے بھی ہمارا ایسا ہی رشتہ ہوگا اگر اس نے اپنی یہ سامراجی پالیسی چھوڑ دی۔

لیکن ڈومینین اسٹیٹس کے متعلق ساری بحث محض ایک نظری چیز ہی بہت عرصہ ہوا جب یہ خیال ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مگر اب تو اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ آج تمام دنیا انقلاب میں مبتلا ہے، اور مصیبتیں اس کے سر پر مسلط ہیں۔ ایسے وقت میں قانون دانوں کی قیل و قال بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے لئے اگر آج کوئی کام اہمیت رکھتا ہے تو وہ اس دستور کو توڑنا اور ختم کرنا ہے۔ دنیا کیلئے آج جو کام اہمیت رکھتا ہے وہ ہسپانیہ اور برطانیہ کی از سر نو ہتھیار بندی اور فرانس کا جنگی قرضہ ہے اور جنگ کی تیاری میں شوریدہ سر اور دہشت انگیز قوتوں کی مسابقت ہے قبل اس کے کہ یہ مصیبت نازل ہو اور تہذیب کی دھجیاں بکھر جائیں۔ یہ مصیبت اچانک اور ناگہانی طور پر کب نازل ہوگی اور موجودہ دنیا کو تباہ و برباد کر دے گی؟ یہ ہے سوال جو آپ کے اور ہم سب کے لئے ہے اس لئے کہ ہمارے جواب اور ہماری اس اہلیت پر جو اس مصیبت پر قابو پا سکے ہندوستانی قوم کے مستقبل کا انحصار ہے ہمارے سامنے فیصلے کے لئے اس سے کہیں زیادہ بڑے مسائل اور انتخاب کے لئے اس سے بدرجہا اہم امور ہیں جو قانون دانوں کے ذہن میں ہیں۔

ان مسائل میں کوئی رائے قائم کرنے اور کوئی طرز عمل اختیار کرنے کے لئے ہمیں قوت استقلال اور ایک منظم قوم ہونے کی ضرورت ہے۔ اِن کیلئے ضروری ہے کہ عوام ایک ایسی تحریک میں شامل ہوں جو سوچ سمجھ کر اور خوب منظم ہو کر آگے بڑھے اور عوام کے مقاصد اور اُن کے بہبود کے لئے کام کرے۔ وہ ان سامراج دشمن طاقتوں کا متحدہ محاذ چاہتے ہیں جن کے متعلق ہم بہت کچھ سُن چکے ہیں، اور جس کا زندہ مجسمہ ہماری نیشنل کانگریس

ہے۔ آزادی مجالس قانون ساز میں رائے دینے یا ادنیٰ اصلاحات کرنے یا حکومت کے کاموں میں زبردستی رکاوٹ ڈالنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے عوام کی قوت کو مقابلے کے لئے تیار کرنا اور مجالس قانون ساز کے اندر جو جدوجہد کی جائے اُسے ملک کی عام جدوجہد کے ساتھ ربط دینا ضروری ہے۔ اس کے لئے حقیقتاً ہمارا مقصد حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرنا ہے اور وہ قوت حاصل کرنا ہے جس کے ذریعے ہندوستانی اپنی قسمت کے متعلق خود فیصلہ کر سکیں۔ اور یہ قوت اور اختیار ہمیں اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم اپنے اندر اپنا مقصد حاصل کرنے کا ارادہ اور قوت پیدا کر لیں۔

یہی وجہ ہے کہ مجلس عاملہ نے دوبارہ اس پر زور دیا ہے کہ مجالس قانون ساز کے کانگریسی اراکین اسمبلیوں کے باہر اپنی سرگرمیاں بدستور جاری رکھیں اور عوام سے تعلق پیدا کریں۔ اگر ہم عوام سے قریبی تعلق نہ رکھیں گے اور اُن کی خدمت کی کوشش نہ کریں گے اور انھیں ان کاموں کے لئے تیار نہ کریں گے جو ابھی کرنے ہیں تو انتخابات میں جو زبردست کامیابی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ بے کار جائے گی۔

ان اصولوں کا اور کانگریس کی پالیسی کا لحاظ رکھ کر ہمیں اس محدود مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ مجالس قانون ساز کے اندر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس محدود مسئلے نے اور خصوصاً وزارتوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے سوال نے بہت زیادہ قیل و قال کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور اکثر اسے موجودہ زمانے کے زیادہ اہم مسائل سے بے تعلق سمجھ کر اس پر غور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اہم مسائل ہمارے ذہن میں رہیں اور کانگریس اور ورکنگ کمیٹی نے ان کا لحاظ رکھنے پر بار بار اصرار بھی کیا ہے تو یہ سوال کہ قانون ساز مجلسوں

میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور بھی زیادہ محدود ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو ضمناً اس لئے کہ جیسا میں نے پہلے بتلایا ہے انتخابات کی نمایاں حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں نے اِس غلامی کے دستور کے خلاف وضاحت سے، بغیر لاگ لپیٹ کے اور شدت کے ساتھ اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا ہے۔ اگر برطانوی حکومت کے دل میں جمہوریت کی کچھ بھی عزت ہے اور اُسے اب بھی جمہوری طریق کار میں خوبیاں نظر آتی ہیں جیسا کہ وہ علی الاعلان کہتی ہے، تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس دستور اور ایکٹ کو واپس لے لے۔ یہ ہے ہمارا دعویٰ اور ہمارا مطالبہ، اور جب تک اس کو تسلیم نہ کر لیا جائے گا ہم اس دستور کی منسوخی کے لئے اپنی ان تھک کوشش اور جد و جہد جاری رکھیں گے۔

مجالس قانون ساز کے کانگریسی ممبروں کا کام کانگریس کی تجاویز نے معین کر دیا ہے۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس ایکٹ کے خلاف لڑا جائے اور دستور ساز مجلس کے قیام کا پر زور طریقے سے مطالبہ اور اُسے ممکن بنانے کے لئے ہر قسم کی تیاری کی جائے۔ بعض لوگوں نے عدم واقفیت کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ کنونشن خود دستور ساز مجلس ہے اور یہ ہندوستان کے لئے ایک نیا دستور مرتب کرے گی۔ لیکن یہ اس قسم کا کوئی کام نہ تو کرے گی اور نہ یہ اس کا منصب ہے۔ ہندوستان کے لئے دستور مرتب کرنے کا وقت ابھی آیا بھی نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ دستور ساز مجلس تمام پارٹیوں کی کوئی عظیم الشان مجلس ہو گی۔ وہ دستور ساز مجلس جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں اسی وقت وجود میں آئے گی جب اس کی پشت پر ایسی قوت موجود ہو کہ وہ اپنے فیصلے نافذ کر سکے اور اسے کسی خارجی طاقت سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

وہ ہندوستانیوں کے حق فرمانروائی کی نمائندہ ہوگی اور ہماری قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

بھلا آج کیسے اس مجلس کا اجلاس ہوسکتا ہے جب کہ برطانوی سامراج اپنی ملک گیر فوجوں، مخبروں، جاسوسوں اور خفیہ پولیس کے بل پر یہاں زبردستی حکومت کر رہا ہے اور شہری آزادی دینے سے انکاری ہے؟ جبکہ ہمارے اتنے عزیز اور ساتھی نظربندی کے کیمپوں اور قیدخانوں میں پڑے گھل رہے ہیں؟ جبکہ یہ سراسر مہمل دستور ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہم نے نہایت غصہ سے اُسے ٹھکرا دیا تھا؟

اس لئے ہمیں اس کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے ہندوستان میں دستور ساز کے لئے اس وقت تک کوئی موقع نہیں جب تک کہ ہم قطعی طور پر سامراج کے اس بوجھ کو ہٹا نہ دیں اور اس کی پیدا کی ہوئی رکاوٹوں کو دور نہ کر دیں۔ اور ہندوستانی قوم فرمانروائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر اُن کو عمل میں نہ لے آئے۔ مگر اس وقت تک کسی ایسے دستور کے لئے بھی ہندوستان میں کوئی موقع نہیں جو زبردستی ہم پر مڑھا جائے بدقسمتی سے یہاں موقع ہے تو صرف اس کش مکش اور جدوجہد کے لئے ہے جو جبر کرنے والے سامراج اور اُس کے پنجے سے نجات کی متلاشی قومیت کے درمیان جاری ہے۔ وہ قومیت اب کمزور نہیں رہی ہے گو اُسے اپنی رہائی کے لئے کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن استبداد اور تحکم کو برداشت نہیں کرے گی

لہذا کانگریس نے ہمیں یہ ہدایت کی کہ ہم مجالس قانون ساز میں تعاون کے ارادے سے نہ جائیں۔ اس لئے کہ یہاں اس قسم کا تعاون تحکم کو تسلیم کرنے

کا دوسرا نام ہے۔ ہمیں وہاں اس ایکٹ کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ دوسرے مسائل کے متعلق ہم جو بھی فیصلہ کریں لیکن ہماری یہ بنیادی پالیسی مستقل ہے اور رہے گی۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم ان افراد اور ان جماعتوں سے کوئی تعلق قائم نہیں کر سکتے جو اس پالیسی کو نہیں مانتے۔

یہ ہیں وہ حدود جن کے اندر رہ کر ہمیں عہدے قبول کرنے کے سوال پر غور کرنا ہے۔ قبل اس کے کہ کنونشن کا اجلاس ختم ہو اور میں بحیثیت صدر کے آپ کے سامنے آؤں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس سوال کے متعلق کوئی فیصلہ کرے گی۔ اور یہ کنونشن اس فیصلے کی پابند ہو گی۔ اس لئے میں یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس موضوع پر میں اکثر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ انتخابات کی کامیابی نے ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو بھی فیصلہ ہو کانگریس کی تجویزوں، بیانات اور پالیسی کا لب لباب یہی ہے کہ ہم اس دستور اور ایکٹ کے ساتھ عدم تعاون کے ارادے پر قائم رہیں۔ معمولاً جمہوری دستور کے مطابق اکثریت میں ہونے کا مطلب وزارتوں کی ذمّے داری کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی جمہوری طریق کار کو کی ذمے داری اور اختیار ہمیں سونپے تو اس سے انکار کرنا ایک غیر معقول اور نامناسب بات ہے۔ لیکن اس دستور میں ہمارے لئے نہ تو جمہوریت ہے اور نہ اختیار۔ غیر معقولیت اور تناقص خود اس دستور میں موجود ہے۔ کیا ہم اس لئے اپنے آپ کو موڑ توڑ لیں اور مسخ کرلیں کہ اس گمراہی کا ساتھ دے سکیں؟ بہر حال ہم اور جو کچھ چاہیں کریں

لیکن ہماری کوششوں کے رگ وپے میں عدم تعاون اور برطانوی سامراج کے خلاف جنگ کا ارادہ سرایت کر جانا چاہیے۔

ہم میں سے اکثر اس بات کے مشتاق اور خواہشمند ہیں کہ عوام کو ان کی مصیبتوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے کچھ نہ کچھ کریں اور کسانوں مزدوروں اور متوسط طبقے کے بے شمار بے روزگاروں کی امداد کریں۔ کون ہے جو یہ کام نہیں کرنا چاہتا؟ کوئی شخص کش مکش یا کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کو پسند نہیں کرتا۔ ہم مدتوں سے اس کے آرزومند ہیں کہ ہمیں وہ مواقع حاصل ہوں تاکہ ہم تعمیری کوششوں کے ذریعے اپنی قوم کی خدمت کر سکیں۔ ہمارے کروڑوں بدنصیب ہم وطن دست گیری کے لئے فریاد کر رہے ہیں اور جب وہ خاموش ہوتے ہیں تو ان کی بے زبان آنکھیں ان کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس ملک میں رہنا مشکل ہے جبکہ چاروں طرف انسانوں کی بربادی اور بدحالی کا منظر سامنے رہتا ہو۔ اکثر تو مصیبتیں بیان بھی نہیں کی جا سکتیں۔ اسی لئے ان کا برداشت کرنا اور بھی مشکل ہے۔ ہم سوراج اور آزادی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں لیکن آدمیت کے نقطۂ نظر سے ان دونوں چیزوں کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے بے پناہ غم اور مصیبتوں سے چھٹکارا پائیں ہم بھی جو کام کرتے ہیں اس کا مقصد آخرکار یہی ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہمیں اس بات کا موقع ملے کہ ہم عوام کی مصیبت ذرا کم کر سکیں تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار نہیں کر سکتے۔

لیکن یہ فائدہ کروڑوں آدمیوں کے لئے ہونا چاہیے۔ گنتی کے چند افراد کے لئے نہیں۔ اگر ہم ان کروڑوں آدمیوں کو سامنے رکھ کر غور

کریں تو بتایئے اس نئے دستور سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کی متعلقہ دفعات بار بار پڑھی ہیں اور ہر بار مجھے اُن لوگوں کی بے باکی پر زیادہ حیرت ہوتی تھی جنھوں نے یہ دستور مرتب کیا ہے اور ہمارے متھے مار دیا ہے اس میں ان سب لوگوں کا تحفظ کیا گیا ہے جنھیں تحفظ کی ضرورت نہیں، اور حکمران کی حیثیت سے ان کے حقوق اور ان کی حیثیت کی توثیق کی ہے۔ اس میں ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے ہیں کہ ہم انھیں ذرّہ برابر نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اور ہندوستان کے عوام کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ غربت کی دلدل میں اور زیادہ دھنستے چلے جائیں۔ اس دستور کے ذریعے ہم عوام کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس کا ممکن نہ ہونا بالکل ثابت ہے۔ ہم جماعت کی کوئی تنظیم نہیں کر سکتے جب تک ہمیں مخصوص عایتوں اور مستقل حقوق والے لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور ہمیں سانس تک لینا دشوار کر دیا ہے۔ ہم کوئی سیاسی، معاشی جماعتی، تعلیمی یا اور کوئی پالیسی کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے جب تک کہ انتظامی محکمہ اور سول سروس ہمارے اختیار میں نہیں ہے اور آمدنی کا بیشتر حصہ ہمارے دست تصرف سے باہر ہے۔ گورنروں اور گورنر جنرل کے مخصوص اختیارات اور ذمے داریوں سے قطع نظر خود یہ ایکٹ ہی ایک وزیر کو بے کار کر دینے کے لئے کافی ہے۔

لیکن بعض اور باتیں ممکن ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم سامراجی نظام کو چلاتے رہنے کا الزام اپنے سر لیں اور ہم قصوروار ٹھہرائے جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ بالواسطہ طور پر اپنے ساتھیوں کو کچلنے کی ذمے داری ہم پر عائد ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم عوام سے اقدام کا حق چھین لیں اور اُن کے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیں جس کے پیدا ہونے میں ہم نے مدد دی ہے۔ یہ سب باتیں ہو سکتی ہیں اگر

ہم وہ راہ اختیار کریں۔ جس میں اس وقت سب سے کم رکاوٹیں نظر آرہی ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے آپ کو صورت حال کے مطابق بنا لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ نہیں ہوگا اس لئے کہ کانگریس اور عوام کی مزاجی کیفیت اس کو برداشت نہیں کرے گی۔ ہم اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب اس قسم کی باتوں کا خطرہ نہیں۔

لہٰذا ہمارا کام نئے دستور کے مطابق عمل کرنا نہیں ہے بلکہ سب سے مناسب طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا اور اس کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالنا ہے۔ جو کہ اس دستور کو دیکھتے ہوئے ناگزیر ہے اور اسی کے ساتھ ہمیں اپنی آزادی کی جدوجہد بھی جاری رکھنی ہے۔

اگر کانگریس کی تجویز کے مندرجہ امور کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور انھیں تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تو مجھے اس دلیل میں کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا۔ عہدوں کے قبول کرنے کے متعلق آل انڈیا کانگریس کمیٹی جو بھی فیصلہ کرے۔ ہمیں مجالس قانون ساز کے اندر اور باہر ان تجاویز کی روح اور الفاظ کی پابندی کرنی چاہیئے۔

ہمارے فیصلے تمام ہندوستان کے فیصلے ہونے چاہئیں اس لئے کہ صوبوں کی معمولی ضرورتوں کے لحاظ سے پالیسی میں اختلاف کا رہنا نقصان دہ ہوگا۔ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور اسی طرح سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کے اتحاد کو اس بات کا خطرہ ہے کہ صوبے الگ الگ کام کریں اور حکومت سے الگ الگ گفت و شنید کرنے پر آمادہ ہو جائیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کنونشن کے لئے اس وقت بھی اور آئندہ بھی سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ مجالس قانون ساز میں ہمارے کام

کی اس خصوصیت کو جس سے سارے ہندوستان کے اتحاد کا پتہ چلتا ہے پیش پیش رکھے اور ایسے رجحانات کو جو افتراق پیدا کریں نہ اُبھرنے دے اور صوبہ واریت کو بڑھنے سے روکے۔ اس کام کا ایک ضروری جزو یہ ہے کہ مجالس قانون ساز کے کانگریسی ارکان کو ایک ہی نظم کے ماتحت رکھا جائے ہمارے مخالفین کی طرف سے ہر ممکن کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ اس نظم اور ہندوستان کی متحدہ پالیسی میں رخنہ ڈالا جائے لیکن ہمیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ بغیر ایسے نظم کے جو خود اپنے اوپر عائد کیا گیا ہو اور بغیر یگانگت کے ہماری طاقت باقی نہیں رہتی۔ اور ہم ایسے افراد اور گروہوں کا مجموعہ بن جاتے ہیں جو آپس میں تعلق نہیں رکھتے اور جنھیں ہمارے مخالفین یکے بعد دیگرے نظر انداز کرتے اور کچلتے رہیں گے۔

کانگریس کو لازمی طور پر ایک ایسی ہمہ گیر پالیسی اختیار کرنی چاہیئے جو ہم سب کی رہنمائی کرے اور اس کنونشن اور اس کے اراکین کو اس پالیسی پر وفاداری کے ساتھ عمل کرنا چاہیئے۔ کنونشن کے اور جو فرائض ہوں گے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی طے کرے گی۔ میں اپنے اس لکھے ہوئے پیغام میں اس کے متعلق قبل از وقت کوئی رائے پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کنونشن یا اس کے نمایندے نہ صرف وہ کام کریں گے جو میں نے اوپر بتلائے ہیں بلکہ وہ قومی یا بین الاقوامی معاملات میں پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کے موقعوں پر ہماری آزادی اور قوت حاصل کرنے کی جدو جہد میں نہایت اہم فرض انجام دیں گے۔

آپ عنقریب اپنے اپنے حلقوں اور اپنے اپنے صوبوں کو واپس

جائیں گے، اور ہمارے ساتھیوں کو اس فیصلے کی اطلاع دیں گے جو یہاں شہر دہلی میں کیا گیا ہے۔ اور جدوجہد کی نئی صورتوں میں حصہ لینے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں گے۔ ہم آزادی کی اس جدوجہد کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں اور ہم میں سے بعض نے تو اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس کی نذر کر دیا ہے۔ اس لئے اگر جدوجہد کی نوعیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو ہم اس سے خائف نہ ہوں گے ہمیں اپنی جدوجہد کی کشتی کو اسی پرانے لنگر کے سہارے قائم رکھنا چاہیئے اور ہر گزرنے والی رو کے ساتھ بہہ جانا چاہیئے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہم ایک انقلاب آفریں دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص کو اچانک اور شدید تبدیلی اور تباہی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قومی یا بین الاقوامی انقلاب جو آنے والا ہے وقت سے پہلے ہی آجائے اور بے خبری میں ہماری گردنیں آن دبائے اس لئے ہمیں اس کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں زمانے کو سست رفتار یا ساکن سمجھ کر نہ سوچنا چاہیئے۔ اور نہ کام کرنا چاہیئے۔

ہمارا اگلا کام پہلی اپریل کو ہڑتال کرنا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس روز آپ اپنے حلقوں میں موجود ہوں گے اور غلامی کے اس دستور کے خلاف اس زبردست مظاہرے میں حصہ لیں گے اور اپنے کروڑوں بھائیوں کے ساتھ مل کر دوبارہ اس بات کا اعلان کریں گے کہ اس دستور کو مسترد کر دینا چاہیئے اور اس کی جگہ دوسرا دستور ہونا چاہیئے جسے دستور ساز مجلس نے بنایا ہو اور جو ہندوستان کی قومی فرمانروائی کو ظاہر کرتا ہو۔

فاشیت[1] اور سامراج

میں نہایت خوشی سے اس مظاہرے میں شریک ہو رہا ہوں جو سپین انڈیا کمیٹی کنگس وے ہال میں کر رہی ہے۔ ہسپانیہ میں جو اندوہناک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اس کا اثر ہم سب لوگوں کے خیالات پر غالب ہے خواہ ہم اس کے پاس کے یورپی ملکوں کے رہنے والے ہوں یا اتنی دور کے ہوں جتنا کہ ہندوستان ہے۔ اس لئے کہ یہ اندوہناک ڈرامہ اور یہ جنگ صرف ہسپانیہ ہی سے تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ ساری دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور جو کچھ انجام کار ہسپانیہ میں ہو گا اس پر ان سب باتوں کے مستقبل کا انحصار ہے جو ہم سوچ رہے ہیں۔ اس وقت بہت سے لوگ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ ہسپانیہ کی جنگ محض ہسپانیہ کا معاملہ نہیں

---

[1] ایک مظاہرے کے موقع پر لکھا گیا۔ جو سپین انڈیا کمیٹی نے کنگس وے ہال میں بمقام لندن ۹ر اپریل ۱۹۳۷ء کو کیا تھا۔

ہے۔ اور نہ اُس کی حیثیت ہسپانیہ کے مختلف گروہوں کے درمیان خانہ جنگی کی سی ہے۔ یہ یورپ کی لڑائی ہے جو ہسپانیہ کی سرزمین میں لڑی جا رہی ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں یہ فاسستی طاقتوں اور بیرونی کرائے کی فوجوں کا ہسپانیہ پر حملہ ہے۔ بہرحال ہسپانیہ پر محسود قوتیں یعنی فاسیت اور فاشیت دشمن اپنے اقتدار کے لئے برسرپیکار ہیں اور جمہوریت جو یورپ کے بہت سے ملکوں میں کچلی جا چکی ہے، جی توڑ کر زندگی کے لئے لڑ رہی ہے۔

جس بات پر اطالوی فاشیت اور جرمنی نازیت ہسپانوی جمہوریت سے برسرپیکار ہیں۔ وہ قاصی واضح ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انگلستان کے زیادہ تر لوگ جو آزادی اور جمہوریت کی حمایت میں ہیں۔ ہسپانوی قوم کے ساتھ ہمدردی کر رہے ہیں۔ لیکن انھی لوگوں میں سے غالباً بہت سے ایسے ہیں کہ جب وہ ہسپانیہ کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی پر غور کرتے ہیں تو وہ شک میں پڑ جاتے ہیں۔ اور جب وہ چند قدم آگے بڑھ کر برطانوی سامراج اور ہندوستان کے تعلقات کا خیال کرتے ہیں تو ساری وضاحت غائب ہو جاتی ہے۔

غرض ہسپانیہ کی جنگ سے جو واقعی سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ فاشیت اور سامراج دونوں سگے بھائی ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ دئے قدم بقدم چلے جا رہے ہیں اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر رکھے ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی موقع پر دونوں ایک دوسرے سے بھڑ جائیں انگلستان والے کم و بیش سب اپنی حکومت کا جمہوری طرز دیکھتے ہیں جو وہ اپنے گھر میں برتتی ہے اور اس سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دوسری جگہ بھی ان کی حکومت کا یہی جمہوری پس منظر ہے۔ لیکن گذشتہ چار سال کے

دوران میں برطانیہ کی خارجی پالیسی سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ جو قوتیں اُس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اُنھیں جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ فاشستی طاقتوں کی نشو و نما کو اچھی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بعض موقعوں پر جہاں برطانیہ کا سامراجی مفاد خطرے میں ہوتا تھا۔ نیم دلی سے اس نشو و نما کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ ہے کہانی برطانوی پالیسی کی۔ مشرق بعید کی حالت میں وسطی یورپ کی سازشوں میں، اس شرمناک غداری میں جو ابی سینیا کے ساتھ کی گئی، اس سوانگ میں جو ہسپانیہ کے معاملے میں غیر جانب دار رہنے کے لئے بھرا گیا۔ یہی پالیسی کارفرما نظر آتی ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ فاشستی اطالیہ نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہسپانیہ کے لوگوں کو کچلنے کے لئے اپنی فوجیں بھیجتا رہے گا۔

بہت سے لوگ برطانیہ کی خارجی پالیسی میں یہ کھلا ہوا تناقض اور اختلاف دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ لیکن اصلی تناقض پالیسی میں نہیں۔ ان لوگوں کے دماغ میں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کی ملکی پالیسی کا جمہوری پس منظر خارجی پالیسی پر بھی حاوی ہے۔ یا بعض اوقات ان وزرار خارجہ یا دوسرے سیاست دانوں کی تقریروں میں تناقض ہوتا ہے جو متضاد رجحانات اور پالیسیوں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے لفظوں کے شعبدے دکھاتے ہیں تاکہ پبلک دھوکا کھا جائے۔ عمل کے میدان میں برطانیہ کی خارجی پالیسی نہایت استقلال اور مستعدی سے اس تگ و دو میں رہی ہے کہ فاشسیت کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔ ہسپانیہ کے اندوہناک حالات نے اُسے ذرا بھی اپنے مجوزہ مقصد سے پیچھے نہ ہٹایا۔ ابھی عدیس ابابا

میں جو روح فرسا خوں ریزی ہوئی ۔ اس کا برطانیہ پر مطلق اثر نہیں ہوا یہاں تک کہ اس خدشے نے بھی کہ شمالی اور وسطی یورپ میں اور بحیرۂ روم میں فاشستی طاقتوں کے زور پکڑ جانے سے برطانیہ کی بین الاقوامی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے اس کی پالیسی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی۔

ایسا کیوں ہے ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہنشاہیت اور فاشیت دونوں میں قریبی رشتہ ہے، اور یہ ایک دوسرے کے اندر ضم ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات سامراج کے دو رخ ہوتے ہیں ——— ایک تو اپنے ملک کا جس کا انداز جمہوری ہوتا ہے اور دوسرا نوآبادیوں کا جو فاشیت سے جا ملتا ہے۔ ان دونوں میں سب سے زیادہ نمایاں دوسرا ہے اور بالآخر زیادہ اہم مسائل میں اُسی کے نقطۂ نظر سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کی ہر برسر اقتدار حکومت خواہ قدامت پسندوں کی ہو یا مزدوروں کی ہو یا قومی ہو، ہندوستان میں وہ فاشستی وردی میں نمودار ہوتی ہے۔ ہندوستان میں حکومت کا رجحان ہمیشہ فاشیت کی طرف رہتا ہے۔ جدید دستور بظاہر صوبوں کے نظام کے اعتبار سے جمہوری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی تصور اور غالباً اس کا عملی پہلو فاشیتی ہے ۔ اس کی وفاقی ترکیب سے تو خاص طور سے فاشیت ٹپکتی ہے۔ صوبوں کے نظام میں اس کا واقعی جمہوری پہلو صرف یہ ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد کو رائے دینے کا حق مل جاتا ہے۔ اور اسی بڑی تعداد نے نہایت شاندار طریقے سے یہ اعلان کیا ہے کہ اس ایکٹ کو مسترد کر دینا چاہیئے۔ اس کے باوجود یہ دستور اور ایکٹ جاری ہے اور جو کثیر التعداد لوگ اس دستور کے مطابق منتخب

ہوئے ہیں۔ وہ بالکل بے دست دپا ہیں۔ وہ کسی طرح اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرسکتے۔

سامراج اور جمہوریت دو مخالف قوتیں ہیں ایک لازمی طور پر دوسری کو ختم کردیتی ہے اور موجودہ دنیا کے سیاسی اور جماعتی حالات میں یا تو سامراج بالکل فنا ہوجائے گا یا اس کا رُخ فاشسیت کی طرف ہو جائے گا اور جب ایسا ہوگا تو ملکی نظام کی شکل بھی بدل جائے گی۔

برطانوی سامراج کے سوال کو جو ہندوستان میں پیش ہے برطانیہ کی ملکی پالیسی سے بہت گہرا تعلق ہے اور مؤخر الذکر اس کے ماتحت ہے۔ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ جب تک سامراج قائم ہے اور ترقی کررہا ہے کوئی بڑی تبدیلی برطانیہ کی جماعتی زندگی میں رونما ہو اس کی خارجی پالیسی میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ہندوستان میں انقلابات ہوں گے اور سامراج کا تصفیہ ہوجائے گا اور ان کی وجہ سے برطانیہ میں بھی اہم تبدیلیاں ہوں گی یا دونوں جگہ کم وبیش ایک ہی وقت میں یہ تبدیلیاں وجود میں آئیں گی۔

ہسپانوی جنگ کا پس منظر ایک عالمگیر جنگ کا پس منظر ہے جس میں ہر جگہ ایک طرف جمہوریت پسند اور آزادی چاہنے والی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف فاشسیت اور سامراج ہیں۔ یہ ہے وہ سبق جو ہسپانیہ کی مصیبتوں، خونریزیوں اور تکلیفوں سے ملتا ہے۔ ہم لوگوں کو جو ہسپانیہ کے حامی ہیں اس سبق کو مع اس کے نتائج کے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے اور ہمیں یکساں طور پر فاشسیت اور سامراج اور ان سب چیزوں کو جو ان کا مظہر ہیں ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک

دینا چاہیئے۔
لیکن اس وقت جبکہ ہم دلیل بازی اور بحث میں مصروف ہیں ہسپانیہ میں خون کی ندیاں جاری ہیں اور بہادر مرد اور بہادر عورتیں یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہماری لڑائی لڑ رہے ہیں، اور انسانی آزادی کے لئے اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ حکومتیں انھیں وہ امداد بھی نہیں دیتیں جو اُن کا حق ہے۔ لیکن دنیا والوں نے اُن کی فریاد سُن لی اور اس کا جواب دے دیا۔ اس لئے کہ یہ فریاد دنیا کی تمام مظلوم قوموں کی فریاد ہے۔
ہم ہندوستانی خود بے یار و مددگار ہیں اور بھوک اور افسوس ناک غربت سے ہمارا ہر جگہ مقابلہ رہتا ہے۔ ہم اپنی آزادی اور اپنے آپ کو اس سامراج سے چھڑانے کے لئے لڑ رہے ہیں جو ہمیں لوٹتا ہے اور کچلتا ہے۔ اسی کے ساتھ قحط، سیلاب اور قدرتی حوادث ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں اور سامراج نے جو بوجھ ہم پر لادا ہے اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے لیکن اپنی اس غربت اور بھوک کے باوجود ہم اپنے ہسپانوی ساتھیوں کی جو مدد کر سکتے ہیں کریں گے۔ اور اگرچہ وہ بہت زیادہ نہیں ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہندوستان کی دلسوزی اور خیر خواہی شامل ہوگی جو لوگ خود تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں انھیں اپنے دوسرے بھائیوں کی بدقسمتی کا بہت زیادہ احساس ہوتا ہے، خواہ وہ کسی جگہ کے رہنے والے ہوں۔

۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء

فلسطین میں عرب اور یہودی

((عربوں کی قومی تحریک اور اُن کی آزادی کی جد و جہد کے ساتھ میرے اظہار ہمدردی پر ہندوستان کے یہودیوں نے میرے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اس لئے میں فلسطین کے اس مسئلے کے متعلق اپنے رویے کی تھوڑی سی وضاحت کئے دیتا ہوں۔

میرے خیال میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں یہ سوچ کر کہ سارے یورپ میں یہودیوں کے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں کی گئی ہیں، اس قوم سے ہمدردی نہ ہو جائے)) ایسے لوگ اور بھی کم ہوں گے جنھیں نازیوں کے اس وحشیانہ اور نسلی تعصب پر مبنی تشدد پر غصہ نہ آیا ہو جو پچھلے چند سال سے یہودیوں پر کیا جا رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ جرمنی کے باہر بھی مختلف فاشستی گروہوں کے لئے یہودیوں کا شکار ایک عجیب مشغلہ بن گیا ہے ((اس نسلی تعصب اور نسلی خبط کی

اس شدت کے ساتھ تجدید مجھے نہایت ناگوار گذری ہے ، اور یہودی نسل کے بے شمار لوگوں کی تکلیفوں سے مجھے روحانی اذیت ہوئی ہے ۔ ان میں سے بہت سے بدقسمت جلاوطنوں کو جن کا کوئی ملک یا گھر ایسا نہیں ہے جسے وہ اپنا کہہ سکیں ، میں جانتا ہوں اور اسے اپنے لئے عزت کی بات سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بعض میرے دوست ہیں ۔

(اس لئے میں اس مسئلے کو چھیڑتے وقت یہودیوں کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی رکھتا ہوں ۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نسل یا مذہبی اختلاف سے متاثر نہیں ہوتا ۔

لیکن جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ برطانوی سامراج نے عربوں کے ساتھ کھلی ہوئی غداری کی ہے ۔ کرنل لارنس یا اور لوگوں نے برطانوی حکومت کی طرف سے عربوں سے جو وعدے کئے تھے اور جن کی وجہ سے عربوں نے جنگ کے زمانے میں برطانیہ کی اور اتحادی طاقتوں کی امداد کی تھی ، جنگ ختم ہونے کے بعد وہ ہر موقع پر نظر انداز کئے گئے ۔ اس وعدہ خلافی کے باعث سیریا ، عراق ، ماورائے یردن ، اور فلسطین کے عربوں کے دل میں ایک ٹیس اٹھتی تھی ۔ بلاشبہ فلسطین کے عربوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی ۱۹۱۵ء سے ان سے برابر یہ وعدہ کیا جارہا تھا کہ وہ آزاد اور خودمختار کردئے جائیں گے ۔ مگر اچانک ایک یہ معلوم ہوا کہ برطانیہ کو فلسطین کا مینڈیٹ یعنی ملک پر حکومت کا عارضی اختیار دیدیا گیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اس بوجھ میں نے اور اضافہ کردیا کہ برطانیہ نے یہودیوں سے "ایک قومی وطن مہیا

وعدہ کرلیا تھا۔ یہ ایک ایسی مصیبت تھی جس کی وجہ سے انھیں اپنے لئے آزادی حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

یہودیوں کو یہ حق ہے کہ وہ بیت المقدس کو اور فلسطین کو اپنا پاک ملک سمجھیں اور وہاں بلا روک ٹوک آجا سکیں۔ لیکن اعلان بالفور کے بعد صورت حال بہت مختلف ہوگئی فلسطین کی ریاست کی حدود میں ایک ایسی نئی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو برطانوی سامراج کی حمایت میں متواتر زور پکڑتی جائے اور یہودیوں کو یہ امید دلائی گئی کہ مستقبل قریب میں اُن کی ریاست اپنے افراد کی تعداد کے لحاظ سے اور معاشی حیثیت سے اس قدر طاقتور ہو جائے گی کہ وہ تمام فلسطین پر اپنا تسلط جمائے گی۔ صیہونیت کی پالیسی نے اس اقتدار کے حصول کو اپنا مقصد بنایا اور اس کے لئے کام کیا۔ اگرچہ میں یہ مانتا ہوں کہ یہودیوں کے بعض طبقوں کی رائے اس جارحانہ رویے کے خلاف تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے عربوں کی مخالفت شروع کردی اور اس بات کے طالب ہوئے کہ حکومت برطانیہ ان کی حفاظت اور امداد کرے۔

یہ صورت یہودیوں کے نزدیک ممکن ہے کہ اخلاقی اعتبار سے اس لئے درست ہو کہ اپنی پاک سرزمین سے اُنھیں پرانے زمانے سے تعلق ہے اور اس وقت بھی وہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ ایک آدمی کو اُن کے اس جذبے سے ہمدردی ہو سکتی ہے! لیکن عربوں کے متعلق کیا کہا جائے؟ عرب خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی اُن کے لئے بھی یہ سرزمین مقدس ہے۔ اُنھیں وہاں رہتے تیرہ سو سال یا اس سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، ان کے قومی اور نسلی اغراض و مقاصد اس ملک سے وابستہ ہوگئے

ہیں فلسطین کوئی غیر آباد جگہ نہیں تھی کہ وہ باہر والوں کی نو آبادی بن سکتی یہاں اچھی خاصی گنجان آبادی تھی۔ اور تمام زمین گھری ہوئی تھی اور اتنی جگہ نہیں تھی کہ بہت بڑی تعداد میں لوگ باہر سے آکر وہاں بس جائیں۔ ایسی حالت میں اگر عربوں نے اس زبردستی داخلے کی مخالفت کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ عربوں نے جب یہ بات محسوس کی برطانوی سامراج کا مقصد یہودی مسئلہ کو اُن کی آزادی کے لئے ایک مستقل رکاوٹ بنانا ہے تو ان کی مخالفت اور بڑھ گئی۔ ہمیں ہندوستان میں اس قسم کی رکاوٹوں کا کافی تجربہ ہے جو ہماری آزادی میں برطانوی سامراج کی طرف سے حائل کی جاتی ہیں۔

یہ بالکل ممکن تھا کہ یہودیوں کی تھوڑی بہت تعداد کو فلسطین والے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اور وہ لوگ وہاں رہنے لگتے، لیکن جب صیہونی اس ارادے سے وہاں آئے کہ عربوں کو تمام اہم مقامات سے نکال باہر کریں اور ملک پر حاوی ہو جائیں تو پھر عربوں کا انھیں خوشی سے جگہ دینا مشکل تھا۔ رہی یہ بات کہ یہودی باہر سے بہت سا روپیہ لائے صنعت و حرفت جاری کی۔ یونیورسٹیاں اور مدرسے قائم کئے تو اس کی وجہ سے عربوں کی مخالفت کم نہیں ہو سکتی۔ انھیں صیہونیوں اور برطانوی حکومت کے ہاتھوں معاشی اور سیاسی اعتبار سے اپنے مغلوب ہو جانے اور مستقل طور پر ایک ماتحت قوم بن جانے کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اور وہ اس سے خوف زدہ ہیں۔

اس طرح اصولی اعتبار سے فلسطین کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ ہے یعنی ایک قوم سامراجی لوٹ اور سامراجی تسلط سے آزادی حاصل کرنے

کے لئے جد و جہد کر رہی ہے ۔ یہ مسئلہ نسلی یا مذہبی مسئلہ نہیں ہے ۔ ممکن ہے کہ ہمارے بعض ہندوستانی مسلمان عربوں کے ساتھ اس لئے زیادہ ہمدردی رکھتے ہوں کہ وہ اُن کے ہم مذہب ہیں ۔ لیکن عرب اُن سے زیادہ عقلمند ہیں ۔ وہ صرف قومیت اور آزادی پر زور دیتے ہیں اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد میں عیسائی اور مسلمان عرب دوش بدوش کام کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس قومی جدوجہد میں جو عرب لیڈر سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے بعض عیسائی ہیں ۔

اگر یہودی عقلمند ہوتے تو عربوں کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو جاتے ۔ مگر وہ بجائے اس کے برطانوی سامراج کا ساتھ دینا پسند کرتے ہیں اور ملک کے لوگوں کے خلاف اس کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں اس لئے بنیادی طور پر یہ جدوجہد سامراج کے خلاف قومیت کی جدوجہد ہو جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ اور تمام پہلو مثلاً عرب یہودی مسئلہ جو اس وقت اہم بن گیا ہے ناقابلِ لحاظ ہیں اور نہ ان کی کوئی تاریخی حیثیت ہے ۔ ہندوستان میں بھی بالکل اسی طرح یہ سامراج کی پروردہ گمراہی یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ بہت بڑا نظر آتا ہے لیکن تاریخ کی وسیع دنیا میں اس کی ساری اہمیت جاتی رہتی ہے ۔

ہندوستان اور فلسطین دونوں کے سامنے قومی مسائل ہیں اور دونوں آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں ۔ اس جد و جہد میں بعض چیزیں ان دونوں کے درمیان مشترک ہیں اور دونوں کا دشمن ایک ہے ۔ ان دونوں صورتوں میں جیسا کہ ہر جگہ بھی ہوتا ہے قومیت نئی

جماعتی قوتوں سے دوچار ہوتی ہے اور اُن سے متاثر ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ عالمگیر مسئلے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہم سب پر اس کا اثر یکساں پڑتا ہے خواہ ہم اس کو محسوس کریں یا نہ کریں۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے۔

اگر ہم اس وسیع نقطۂ نظر سے غور کریں تو عرب یہودی مسئلہ حقیر سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب اپنی آزادی حاصل کریں گے۔ لیکن اس کامیابی کا ایک سبب عرب قوم کا وہ وسیع اتحاد ہوگا جس کے لئے مغربی ایشیا کے ممالک مدتوں سے آرزو مند ہیں۔ اور یہ اتحاد ایک نئی تنظیم کا جزو ہوگا جو موجودہ زمانے کے انتشار کو دور کرنے کے بعد پیدا ہوگی۔ یہودی اگر عقلمند ہیں تو وہ تاریخ سے سبق لیں گے عربوں سے دوستی کر کے اور فلسطین کی تحریک آزادی میں شامل ہو کر اس کی قوت کو بڑھائیں گے اور سامراجی قوت سے فائدہ اُٹھا کر تسلط حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔

(مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے لوگ فلسطین کے عربوں کو اس جدوجہد پر جو وہ اپنے طاقتور دشمن سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ دلی مبارکباد پیش کریں گے اور ان کی کامیابی کے لئے دعا کریں گے)

۱۳ر جون ۱۹۳۶ء

ہسپانیہ اور فلسطین[۵]

ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں آج چاروں طرف، آنیوالے صوبجاتی انتخابات کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور ہر جگہ ان انتخابات کے لئے اُمیدوار پیدا ہو رہے ہیں۔ جوں جوں دن گذرتے جائیں گے ان انتخابات کے چرچے غالباً بڑھتے جائیں گے، اور تمام فضا اس جوش و خروش اور شور و غل سے گونج اُٹھے گی جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ذہن دوسرے سوالات میں بھی اُلجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ سوال، یا ہندی اُردو کی حقیر بحث وغیرہ لیکن یہ سب سوال ہماری غربت اور بے روزگاری کے زبردست مسائل کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ——— وہ غربت جو ہمارے کروڑوں آدمیوں کو کچل رہی ہے اور وہ بے روزگاری جس نے ہمارا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔ ہمارے

۵۔ یہ تقریر ۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں یوم فلسطین کے موقع پر کی گئی تھی۔

لئے ان مسائل کے متعلق سوچنا ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ ہمارے فکر اور عمل کی دنیا ہندوستان ہے۔

لیکن اپنے آپ کو ہندوستان کے مسائل تک محدود رکھنا کچھ موزوں بات نہیں ہے۔ یہ چیز ہمارے قومی مقاصد اور ہماری آزادی کی جدوجہد کے لئے بھی کفایت نہیں کرتی۔ قومی زندگی کا ہر مبتدی یہ جانتا ہے کہ مختلف ملکوں کے سیاسی اور معاشی مسائل ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں، آج دنیا کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ اور جن اہم مسائل کا ہمیں سامنا ہے وہ لازمی طور پر بین الاقوامی مسائل ہیں۔ کسی اہم مسئلے کی اس عالمگیر حیثیت کو نظرانداز کرنا چیزوں کی نسبتی ترتیب کو کھو بیٹھنا ہے اور اپنے آپ کو جان بوجھ کر غلطی میں ڈالنا ہے۔

آئیے آج کل کی دنیا پر نظر ڈالیں، اور اس کی کش مکش، بے چینی، ظلم و ستم اور رنج و الم کو دیکھیں۔ جس کا پس منظر یہ سوال ہے کہ یہ سب کیوں ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہم آج خاص طور سے چھوٹے سے ملک فلسطین اور اس کے مصائب کے متعلق غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں دنیا کے تمام مسائل کو دیکھتے ہوئے فلسطین کا یہ مسئلہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے کہ اور جگہ اس سے زیادہ بڑے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے اور اس سامراج کے طریق عمل پر روشنی ڈالتا ہے۔ جس کے ہاتھوں ہم لوگ بھی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ہمارا اس کے متعلق سوچنا اور ان لوگوں کو جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں مبارک باد دینا نہایت مناسب ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم فلسطین کے متعلق سوچیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے آپ کی توجہ ہسپانیہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، اس لئے کہ ہم دنیا کے منظر کو اس کے ذریعے زیادہ بہتر دیکھ سکیں گے۔ آج ہسپانیہ ہی وہ جگہ ہے۔ جہاں زبردست واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ یہ واقعات نہایت خوفناک اور دہشت انگیز ہیں۔۔اور یورپ اور دنیا کے مستقبل پر ان کا اتنا اثر ہوگا کہ ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم ہندوستان والوں کی قسمت اُن کے ساتھ جس طرح وابستہ ہے اس کا ہمیں ابھی پورا احساس نہیں ہے۔

ہسپانیہ میں کیا ہوا؟ کچھ مہینے گذرے وہاں معمولی جمہوری طریقے پر انتخاب ہوا، اور ایک اصلاح پسند پارٹی یعنی ایک متحدہ جمہوری محاذ برسر اقتدار آگیا۔ انھوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس میں جمہوری اور لبرل خیال کے لوگ شامل تھے۔ یہ حکومت اشتمالی کیا اشتراکی بھی نہیں تھی۔ اُنھوں نے اصلاح کا ایک پروگرام بنا کر کام شروع کیا تاکہ ہسپانیہ اس جاگیرداری اور رجعت پسندی کے بندھنوں سے نجات پائے جن میں وہ اتنے عرصے سے پھنسا ہوا ہے۔ وہ اپنا کام اچھی طرح کرتے رہے۔ لیکن اچانک فوجی بغاوت شروع ہوگئی۔ جن کے سرکردہ فوجی افسر اور دوسرے رجعت پسند لوگ تھے۔ بغاوت کی ابتدا ہسپانیہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس نے غیر ہسپانوی فوجوں کی امداد سے مراکو میں جنم لیا یہ بغاوت قانون اور ضابطہ (جو الفاظ برطانوی حکومت کو بہت زیادہ عزیز ہیں) ملک کی دستوری حکومت اور ایک اعتدال پسند لبرل نظام کے خلاف کی گئی تھی۔

افسران فوج کو بغاوت کا جھنڈا بلند کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟

یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی ہے۔ انھوں نے یہ بغاوت اس لئے کی کہ انھیں فاشستی ملکوں یعنی جرمنی اور اطالیہ نے خاصی امداد بہم پہنچائی۔ اور یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ان لوگوں کی مالی امداد شہر لندن کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے کی گئی۔

ہسپانوی حکومت اور وہاں کے لوگ ہکا بکا ہو کر رہ گئے غیر منظم عوام کے لئے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھے۔ یہ انتہائی مشکل تھا کہ وہ منظم اور پوری طرح مسلح فوج کی بغاوت کا مقابلہ کر سکتے۔ اسی وجہ سے باغیوں کو یہ توقع تھی کہ وہ آسانی سے فتح پا لیں گے۔ لیکن ہسپانیہ کے لوگ اپنی ہر دلعزیز حکومت کے حکم سے بغیر کسی نظم کے اور بغیر ضروری ہتھیاروں کے نکل کھڑے ہوئے اور بہادری سے ان باغی فوجوں کا مقابلہ کیا جن میں سے اکثر دستے مراکشی تھے۔ قوم کے ہر شخص کو جو اس لائق تھا فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا۔ حتیٰ کہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی آزادی کو بچانے کے لئے جو بڑی مشکل سے حاصل کی گئی تھی دوڑ دوڑ کر آتے تھے۔ کتنا عجیب منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ عوام باقاعدہ فوجوں کے خلاف لڑے اور اکثر انھیں آگے نہ بڑھنے دیا۔

دوسرے ملکوں پر اس لڑائی کا جو اثر ہوا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ نازی جرمنی اور فاشستی اطالیہ بالکل باغیوں کی طرف تھے اور انھوں نے انھیں ہر قسم کی مدد دی۔ فرانس کو ہسپانیہ کے ساتھ ہمدردی تھی لیکن اس نے مدد دینے کی جرأت نہیں کی۔ انگلستان کے ٹائمز جیسے بڑے بڑے اخبارات نے کھلم کھلا باغیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ برطانوی حکومت اور برطانیہ کے حکمران طبقوں کا کیا نظریہ ہے

برطانیہ کے سرمایہ دار باغیوں کی فتوحات پر خوشی مناتے تھے۔ یورپ کی حکومتوں نے غیر جانب دار رہنے کی پالیسی کا اعلان کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہسپانوی حکومت کو تو مدد نہ مل سکے۔ لیکن باغیوں کو باہر سے مدد پہنچتی رہے۔

غرض یہ خوفناک جنگ ہسپانیہ میں جاری ہے اور ہر طرح باغیوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے۔ لیکن عوام الناس مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں خوب مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور اپنے ملک کو خونیوں اور رجعت پسندوں کے استبداد کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں جانیں دے رہے ہیں۔

آج ہسپانیہ میں ہم ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں کا تصادم واضح شکل میں دیکھ رہے ہیں یہی وہ کش مکش ہے جو امکان کے طور پر ہر جگہ موجود ہے۔ اس کش مکش کے نتیجے پر یہ بات منحصر ہے کہ آیا یورپ اور تمام دنیا فاشسیت کے زیر اقتدار آتی ہے یا نہیں۔ اسی پر اس خونریز اور وسیع جنگ کا انحصار ہے جو تمام دنیا میں پھیل جائے گی۔ باغیوں کی فتح کا مطلب یہ ہے کہ تین فاشستی ملک جو فرانس کے اِدھر اُدھر واقع ہیں، اس کا گلا گھونٹیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فاشیت جاپان کے تعاون سے تمام دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کرے گی۔

اس اہم مسئلے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکمران طبقے اور برطانوی حکومت قطعی طور پر فاشسیت کی پاسداری کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سامراجی برطانیہ ایک طرف تو جمہوریت کی ڈینگیں مارتا ہے اور دوسری طرف اُن لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے جو ہسپانیہ میں جمہوریت کو کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہسپانیہ میں جو لڑائی ہو رہی ہے وہ

اشتمالیت یا اشتراکیت اور فاشیت کے درمیان نہیں ہے بلکہ جمہوریت اور ظالم فاشیت کے درمیان ہے۔

یہ تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اصل میں سامراج اور فاشیت ایک ہی خاندان سے ہیں۔ جب کوئی خطرہ پیدا ہوتا ہے تو یہ متحد ہو جاتے ہیں یہ دونوں آج تمام دنیا میں ترقی پسند قوتوں کے مقابلے پر ہیں۔ یورپ میں جماعتی ترقی کی مخالفت کرتے ہیں اور ہندوستان اور دوسرے ماتحت ممالک میں سیاسی ترقی کو بھی روکتے ہیں۔ سامراجی اور فاشستی طاقتوں میں بھی جب کبھی اختلاف موجود ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے بہت سی لوٹ کے مال میں زیادہ حصہ لینا چاہتی ہیں۔ لیکن آپس کے اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرتی ہیں اور جماعتوں میں آزادی کی رو اور اس جدوجہد کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں، جو کوئی قوم سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے کرتی ہے۔ اس طرح ہم ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو دنیا کی اس جدوجہد کا ایک حصہ سمجھتے ہیں جو سامراج اور فاشیت کے خلاف جاری ہے۔ یہی کیفیت اس جدوجہد کی بھی ہے جو فلسطین میں برطانوی سامراج کے خلاف ہو رہی ہے۔

ہمیں ان بڑے مسائل پر نظر رکھنی چاہیے اور انھیں صحیح سمجھنا چاہیے ورنہ ہم بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں گے اور واقعات کو سمجھنے میں ناکام رہیں گے۔ لیکن اگر ہم اپنے مشاہدے کو اپنے سامنے رکھیں اور اُسے اپنا معیار بنائیں تو ہم واقعات کے متعلق صحیح فیصلہ کر سکیں گے اور یہ جان لیں گے کہ کون جماعت یا فرد اس جدوجہد میں اس طرف ہے اور کون اس طرف

ہندوستان میں ہمیں بعض اوقات ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے آپ کو خارجی

معاملات کا ماہر بتلاتے ہیں ۔ یہ لوگ ہسپانیہ کے باغیوں کی تحریک سے یا فاشیت سے بالعموم ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے بعض اخبارات بغیر سوچے سمجھے ان کے اس نقطۂ نظر کو مان لیتے ہیں لیکن اصل میں یہ رجعت پسندی اور فاشستی تحریک کے لئے پروپیگنڈا ہے ۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستان کے رجعت پسند دوسری جگہ کے رجعت پسندوں سے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں ۔

فلسطین کا مسئلہ بظاہر عربوں اور یہودیوں کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور ہمارے بعض ہندوستانی مسلمان دوست اس کو مذہبی مسئلے کی حیثیت دیتے ہیں جس میں انھیں اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی کرنی چاہیئے ۔ یہ نظریہ غلط اور گمراہ کن ہے ۔ یہ مسئلہ تو ایک ایسی قومیت کا ہے جو ترقی کی طرف جارہی ہے اور آزادی چاہتی ہے ۔ مگر سامراج اس کو دبا رہا ہے ۔ اس مقصد کے لئے برطانوی سامراج نے وہاں بھی ہندوستان کی طرح ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے لڑانے والی چال چلنے کی کوشش کی ہے ۔ اور عربوں کے مقابلے میں یہودیوں کو لا کھڑا کیا ہے ۔ ہمارے یہاں کے فرقہ وارانہ مسئلہ کی طرح فلسطین میں بھی انھوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا کرنے کی راہ نکالی ہے ۔ یہی فرانسیسی حکومت نے بھی سیریا میں کیا ہے ۔ ہمیں اس سے یہ بات جان لینی چاہیئے کہ ماتحت ممالک میں اس فرقہ وارانہ مسئلے کی اصل میں تخلیق کیونکر ہوئی ؟ اور اس کے بنیادی سبب کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔

یہ صحیح ہے کہ اس وقت فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان تصادم اور عداوت پھیلی ہوئی ہے ، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا واقعی حل

یہی ہے کہ دونوں قوموں کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے جس کی بنیاد ملک کی آزادی پر ہو۔ یہودی ظالم فاشیت کے شکار رہے ہیں اور اب بھی ہیں ہمیں ان کی مصیبتوں کا احساس ضرور ہونا چاہیے۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ انھوں نے فلسطین میں برطانوی سامراج کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اُن سے ناجائز فائدہ اُٹھائے۔ اب فلسطین میں ان کے مستقبل کی بہتری اسی پر منحصر ہے کہ وہ عربوں کے ساتھ تعاون کریں اور اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ فلسطین عربوں کا ملک ہے اور لازمی طور سے انھی کا رہے گا اگر یہودی یہ بات مان لیں تو تعاون آسان ہے۔ اور عرب انھیں فلسطین میں بھی اور ماورائے یردن میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ یہودی ملک کی بہتری میں مدد دیں اور یہ کام وہ کر بھی سکتے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں عربوں اور یہودیوں میں تعاون رہا ہے اور دونوں دوستوں کی طرح زندگی بسر کر چکے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ پھر اسی طرح مل جل کر نہ رہ سکیں

اس وقت جو مسئلہ پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی سامراج نے عربوں کی تحریک کو کچلنے کا نئے سرے سے ارادہ کیا ہے۔ مزید بڑی بڑی برطانوی فوجیں ملک کو تقریباً از سر نو فتح کرنے کے لیے فلسطین بھیجی جا رہی ہیں۔ وہاں شان سے فوج کی حکومت ہوگی۔ ہمیں اس مصیبت کے وقت فلسطین والوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنی چاہیے اُن کی تحریک کا کچلا جانا ہماری اور ان کی قومی قوت کو صدمہ پہنچائے گا ہم دونوں آزادی کی اس عالم گیر جد و جہد میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ فلسطین میں قابل افسوس اور شرمناک واقعات رونما ہو رہے ہیں [illegible] نفرت کا اظہار کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ

ایک اچھی تحریک کو کمزور اور بدنام کرتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بعض جاگیردارانہ عناصر قومیت کے جذبے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ جدوجہد دراصل عربوں کی قومی جدوجہد ہے جو برطانوی سامراج کے پنجے سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور سامراج کی تمام طاقتیں اس کو کچلنے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ تحریک کچلی نہ جاسکے گی اس لئے کہ قومیت اور آزادی کا ارادہ اب بھی باقی ہے۔

اگرچہ ہم فلسطین والوں کے ساتھ اپنی ہمدردی اور خیرخواہی کا اظہار کر رہے ہیں، لیکن اُن کی مدد کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنا فرض بہترین طریقے سے انجام دیں۔ یہ اس عظیم الشان جدوجہد کا جو عالمگیر سامراج کے خلاف جاری ہے ایک دوسرا اور غالباً سب سے زیادہ اہم رُخ ہے۔ یہ انتہائی لغویات ہے کہ ہم ایک طرف تو عربوں کے ساتھ ہمدردی کا دم بھریں اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی سامراج کا ساتھ دیں۔

لہذا ہمارے لئے اس مسئلے کی نوعیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھیں۔ وہ لوگ جو دوسرے اور فروعی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ پہلو، اور اصل مسئلے سے توجہ ہٹاتے ہیں۔ اپنی جدوجہد میں اگر ہم ان معمولی صلاحوں کی طرف توجہ کریں اور اس میں اُسی سامراج سے مدد لیں جس کو ہم نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہماری قوت ضائع ہوگی اور ہماری تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ کانگریس کے انتخابی منشور میں ہماری جدوجہد کے اس نہایت اہم پس منظر کو خاص طور پر

نمایاں کیا گیا ہے۔ اس منشور کا ملک نے عام طور پر خیر مقدم کیا ہے۔ اگرچہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس پر خفا ہیں۔ یہاں ہمیں وہ بنیادی فرق معلوم ہو جاتا ہے جو ہماری عظیم الشان انجمن اور دوسرے لوگوں میں ہے جن کی بصیرت واضح نہیں ہے۔ یہ انجمن سامراج دشمنی اور مخصوص اصولوں کی حمایت کرتی ہے اور وہ لوگ شخصیتوں، معمولی اصلاحوں یا فرقہ وارانہ قواعد کی فکر میں رہتے ہیں۔ اگر ملک آزادی چاہتا ہے تو اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ تمام لوگ کانگریس کے دوش بدوش کھڑے ہو جائیں اس شرط کے ساتھ ہمارا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے۔ ہماری جماعت کوئی مخصوص لوگوں کا گروہ نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ برطانوی سامراج کے ساتھ تعاون کی فکر میں رہتے ہیں ان کے ساتھ ہمارا اشتراک نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ عزت کے لائق ہوں۔ جیسے کہ بہت سے ہیں۔ لیکن سوال شخصیتوں کا نہیں بلکہ اصولوں کا ہے۔ اس زبردست عالمگیر بے چینی میں جس کے بادل افق پر چھا رہے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم رجعت پسند اور سامراجی طاقتوں کے مقابلے کے لئے متحدہ اور مضبوط محاذ قائم کریں۔ یہ محاذ صرف کانگریس نے قائم کیا ہے۔

کانگریس کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ صرف اس ایک معاملے میں کہ جدید دستور کے ماتحت عہدے قبول کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ اس بارے میں میں بارہا اپنے خیال کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور میں اسی وثوق کے ساتھ اس پر قائم ہوں۔ یعنی یہ کہ ہمیں عہدے یا وزارتیں نہ قبول کرنی چاہئیں ورنہ ہم اس نئے ایکٹ کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔ یہ نتیجہ

کانگریس کے منشور سے خود بخود نکلتا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وقت آنے پر اس کا فیصلہ یہی ہوگا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء

فرقہ وارانہ تصفیہ (کمیونل اوارڈ)

پنجاب میں تقریریں کرتے ہوئے میں نے کئی موقعوں پر کمیونل آوارڈ کا ذکر کیا ہے میں ہندوستانی میں لمبی تقریریں کروں اور اُن کی مختصر رپورٹ انگریزی میں لکھی جائے تو میری باتوں کے متعلق لوگ کسی قدر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جو تنقید ان پر کی جاتی ہے وہ بعض اوقات غلط معلومات کی بنیاد پر مبنی ہوتی ہے۔ ہمیشہ مناسب ہے کہ اختلافی مسائل کے متعلق خیالات وضاحت سے پیش کئے جائیں تاکہ اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی ہم مسائل کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس لئے میں یہاں مختصراً یہ بتلاتا ہوں کہ فرقہ وارانہ تصفیہ کے متعلق میرے خیالات کیا ہیں۔ میں اپنے لکھنؤ کانگریس کے خطبے میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ میں نے یہ بتلایا تھا کہ فرقہ وارانہ تصفیہ اور جمہوریت دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ فرقہ وارانہ تصفیہ کو صحیح تسلیم کرنا

جمہوریت سے انکار کرنا ہے۔ اور لازمی طور پر یہ چیز آزادی اور اُن
اور جماعتی مسائل کے حل کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جو ہمارے
حقیقی مسائل ہیں۔ میرے خیال میں کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو آزادی
اور جماعتی انقلاب کا دلدادہ ہو اور وہ فرقہ وارانہ تصفیے کو تسلیم کرے
یا اُسے اچھی نظر سے دیکھے مجھے اس بات پر سخت تعجب اور افسوس ہے
کہ ہمارے بہت سے مسلمان دوست اور ساتھی جو ہندوستان کی آزادی
کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مضرت رساں فرقہ وارانہ تصفیے کو اچھی
نظر سے دیکھتے ہیں۔

اس ایوارڈ کے بارے میں میرے غیر جانب دار رہنے یا اپنی کوئی
قطعی رائے ظاہر نہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور جہاں تک مجھے
معلوم ہے کانگریس کا بھی اس معاملے میں یہی نظریہ ہے۔ میری تو یہ
عادت ہی نہیں کہ میں اہم معاملات میں غیر جانب دار رہوں۔ میں فرقہ وارانہ
تصفیے کے بالکل خلاف ہوں اور اسے خوشی سے کبھی منظور نہیں کر سکتا
میرے نزدیک اسے تسلیم کرنے کا مطلب سیاسی اور جماعتی آزادی اور
جمہوری روایات کو بھلا دینا ہے۔

لہٰذا میرے سامنے ایوارڈ کو پسند یا ناپسند کرنے یا غیر جانب دار
رہنے کا سوال نہیں ہے۔ میں غیر جانب دار نہیں ہوں اور میں اس تصفیہ
اور ایوارڈ کو بہت برا سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ کہ کس طرح اس ناگوار چیز
سے خلاصی حاصل کی جائے؟ میرے نزدیک تو اس سے رہائی پانے کے
صرف دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو آزادی کا راستہ ہے۔ جبکہ لازمی طور
پر اس قسم کی تجویزیں ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ زیادہ جمہوری طریقے

رائج ہوں گے۔ دوسرا ان جماعتوں میں جو خاص طور سے اوارڈ سے دلچسپی لیتی ہیں۔ باہم توافق اور سمجھوتے کا راستہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کردوں کہ میرے خیال میں اُن جماعتوں کے درمیان کسی حقیقی سمجھوتے کا امکان نہیں ہے جو آزادی کی حمایت میں ہیں اور جو اس امید میں ہیں کہ وہ ہمیشہ برطانوی سلطنت کے زیر سایہ رہیں گی۔ دونوں کی نظر مختلف چیزوں پر ہے اور دونوں مختلف مقاصد کے لئے کام کرتی ہیں۔

یہ توقع رکھنا کہ برطانیہ اس معاملے میں ہماری مدد کرے گا ایسا ہی ہے جیسا کسی ناممکن بات کی توقع کرنا۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اُن کا فائدہ ہماری امداد نہ کرنے میں ہے۔ رہے فرقوں کے رہنما اُن سے بھی ان کی توقع کرنا بے سود ہے۔ اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ عوام کو معاشی اور قومی مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے جو اُن پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں اور اس طرح اُنھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ سوال کو اس کی صحیح صورت میں دیکھ سکیں۔ کمیونل اوارڈ پر زور دیتے رہنا، اپنے نصب العین کو چھوڑ دینا ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کو دوسرے مسائل کے متعلق سوچنے سے روکتا ہے۔

فرقہ وارانہ سوال کے متعلق عرصہ ہوا کہ کانگریس نے اپنے نظریے کی وضاحت کردی ہے۔ اور یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ مسائل کو قومی نقطۂ نظر سے جمہوری طریقے پر عمل کرنے کی طرف دار ہے لیکن اگر متعلقہ جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جائے تو وہ غالباً اُسے منظور کرلے گی۔ اس کے علاوہ آزاد ہندوستان کے واسطے دستور مرتب کرنے اور فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ کرنے کے لئے وہ دستور ساز مجلس کے مطالبے پر زور دیتی ہے۔

۲ جون ۱۹۳۶ء

برما اور سیلون

حال ہی میں برما سیاسی اعتبار سے ہم سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور سیلون کا نظم و نسق مدتوں سے برطانوی سلطنت کے ماتحت ہندوستان سے الگ ہے۔ لیکن برطانیہ کی سامراجی پالیسی کی ضرورتوں کا تقاضا خواہ کچھ بھی ہو، ہندوستان، برما اور سیلون اپنے وہ تمدنی اور تجارتی تعلقات فراموش نہیں کر سکتے جو ہزاروں برس سے ان میں قائم ہیں۔ ان ملکوں کے سیاسی نقشے اس لمبے زمانے میں بار بار بدلے ہیں لیکن ہمارے گہرے رشتے اسی طرح قائم ہیں اور قائم رہیں گے ان کے قائم رہنے کے اور بھی وجوہات ہیں۔ آج بنیادی طور پر ہمارا مسئلہ ایک ہی ہے اور ہمارا دشمن بھی ایک ہے۔ وہ دشمن برطانوی سامراج ہے، اور وہ مسئلہ اپنی قوم کی آزادی کا سوال ہے۔ تمام دنیا میں واقعات نہایت تیزی سے رونما ہو رہے ہیں اور جس کام میں صدیاں لگتیں وہ

چند برس میں ہو جاتا ہے۔ سامراج فاشسٹ کا سہارا لے کر اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ لیکن اس کی یہ کوشش بے سود ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان، برما اور سیلون کے لوگوں کی آزادی اور اسی طرح باقی دنیا کے لوگوں کی آزادی عرصے تک تاخیر میں نہیں ڈالی جا سکتی۔

اس جد و جہد میں جو سامراجی، معاشی اور جماعتی آزادی چاہنے والی زبردست قوتوں کے درمیان جاری ہے۔ برطانوی پالیسی ہمیشہ ہمیں کمزور کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ ہم میں ایسے رجحانات پیدا کرتی ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیں۔ ہمیں چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور ان جھگڑوں کو بڑھاتی رہتی ہے۔ ہمیں اس سے خبردار رہنا چاہیئے۔ عالم گیر خطرے کے بادل افق پر چھا رہے ہیں اس کے پیش نظر برطانوی حکومت مشرق میں جو تیاریاں کر رہی ہے، یہ کارروائی ان کے استحکام کے لئے ہے۔ برما اپنی زمین کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ذرا آگے سنگاپور ہے جو جنگی اعتبار سے اہم مقام ہے اور ایک زبردست بحری مرکز ہے۔ یہاں سے مشرق اور مغرب کی ناکا بندی کی جا سکتی ہے۔ سیلون میں ٹرن کومالی کے مقام پر نہایت اہم ہوائی اور بحری مرکز قائم کیا گیا ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جو صورت حال پر غالب ہیں اور ان کے آگے پیچھے عالم گیر جنگ کا خطرہ رہتا ہے۔ ہمیں اپنے چھوٹے مسائل پر ان کے سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیئے۔

برما میں بھی اور سیلون میں بھی دونوں جگہ شور مچایا گیا ہے کہ ہندوستانی

ہمیں لوٹ رہے ۔ اس بات پر ہمیں تعجب ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ زیادہ تر برطانوی سامراج اور برطانوی تجار کے نمائندے ہیں ۔ جو صدیوں سے باقاعدہ طور پر اور نہایت بے دردی سے ہمارے ملکوں کو لوٹ رہے ہیں اور لوٹتے لوٹتے ہمیں نہایت وحشت ناک غربت میں مبتلا کر دیا ہے ۔ وہ اس لوٹ کے واحد اجارے دار رہنا چاہتے ہیں ۔ مگر چونکہ بعض کاموں میں ہندوستانی بیوپاری اُن کے مقابلے پر آگئے ۔ اس لئے انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ ہندوستانیوں برمیوں اور سیلونیوں کے تعلقات میں تلخی پیدا ہو جائے ۔ اب ایسے معاملات میں جھگڑے ہو رہے ہیں ۔ جن میں پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں ایک دوسرے کے مال پر محصول لگا دیں اور اُن کے درمیان ویسی ہی تجارتی لڑائیاں ہوں جیسی باقی دنیا میں ہو رہی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ حماقت کی انتہا ہوگی ۔ اگر ہندوستان ، سیلون کے ناریلوں پر محصول لگا دے تو سیلون کا کیا حشر ہوگا ؟ سیلون اور برما جن ملکوں سے تجارت کرتے ہیں ۔ ان میں سب سے پہلا درجہ ہندوستان کا ہے ۔ اگر ہم میں کوئی تجارتی کش مکش پیدا ہو جائے تو لازمی طور پر ہم سب کو نقصان ہوگا ۔

لیکن ہم میں کش مکش پیدا ہی کیوں ہو ؟ ہمارے اتحاد کے لئے صرف یہی ایک بات نہیں کہ ہمارے تمدن کا پس منظر مدتوں سے مشترک ہے بلکہ ہمارے سیاسی اور وسیع تجارتی مفاد بھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے ۔ مزدوروں کے مفاد کی وجہ سے بھی کوئی واقعی کش مکش نہیں پیدا ہوتی ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر بعض تجارتوں میں مقابلہ آن پڑا ہو ۔

لیکن اس کا اثر زیادہ بڑے مفاد پر نہیں پڑتا۔ اس قسم کے مقابلوں میں آسانی سے توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ہم بے شک یہ بات چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کے لوگ جہاں کہیں بھی ہوں ہم ان کی حفاظت کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے، خواہ وہ غریب مزدور یا ایک قلی ہی کیوں نہ ہوں۔ تاکہ ہندوستان کا وقار قائم رہے گو آج ہمارے پاس کوئی طاقت ایسی نہیں ہے کہ اُن کی موثر طریقے سے حفاظت کر سکیں۔ لیکن ہم ارادہ رکھتے ہیں اور ہم بہت جلد وہ طاقت حاصل کر لیں گے ہمارا قومیت کا تصور وہ ناگوار نسلیت کا تصور نہیں ہے جو دوسرے کے حقوق کو نظر انداز کر دیتا ہے اور انھیں غضب کر جاتا ہے۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل جل کر امن سے رہنا چاہتے ہیں تاکہ ہم دونوں پھلیں پھولیں۔ اور دونوں کو فائدہ ہو۔ ہم تجارت اور تجارتی تعلقات کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور تجارتی رکاوٹیں پیدا کرنے کے خلاف ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ناگزیر صورت حال ہم کو اس پر مجبور نہ کرے۔

اپنے تمام پڑوسیوں سے اور ان لوگوں سے جو ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے تعلقات اسی صلح و آشتی کے اصول پر مبنی ہوں گے۔ لیکن برما اور سیلون تو ہمیں پڑوسیوں سے بھی زیادہ ہیں وہ تو خود ہمارے جسم کا ایک ٹکڑا ہیں، ہمارا گوشت پوست تقریباً ایک ہی ہے جو بھی کچھ ہو ہم ایک دوسرے کے خلاف کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ انھیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ ہم ہندوستانیوں کو اس ناپاک پروپیگنڈے سے کوئی تعلق نہیں جو جدائی اور نفرت ڈالتا ہے۔ ہمیں اس کا بالکل اعتراف ہے کہ برما اور سیلون جداگانہ سیاسی وجود

اور انفرادیت رکھتے ہیں ان دونوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا راستہ خود منتخب کریں۔ یہ راستہ جس قسم کا بھی ہو۔ ہندوستانی بہرحال ان کے خیرخواہ رہیں گے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ میرے ملک والے یہ بات کبھی گوارانہ کریں گے کہ وہ برما اور سیلون کے لوگوں کو لوٹیں۔ ہم برطانوی سامراج کے ماتحت کافی لُٹ چکے ہیں۔ اب ہمیں متحد ہو کر اس سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ برمی اور سیلونی ان مسائل پر اس وسیع نقطۂ نظر سے غور کریں گے۔ اور یہ بات سمجھ لیں گے کہ برمیوں، ہندوستانیوں اور سیلونیوں کے مفاد میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ ہم میں پہلے بھی دوستانہ تعلقات قائم تھے اور آئندہ بھی اسی طرح رہیں گے۔

چھ سال ہوئے جب میں سیلون گیا تھا اس وقت سے میری زندگی پریشانیوں میں گذری ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو عمریں گذر گئیں۔ لیکن اس سیر کی یاد اب تک میرے دل میں باقی ہے۔ اور میں اس سے لطف اُٹھاتا رہتا ہوں۔ وہاں کے سب لوگوں نے جس طرح میرا خیر مقدم کیا اور جس محبت سے وہ میرے ساتھ پیش آئے میں اُسے کیسے بھول سکتا ہوں؟ اور اس جزیرے کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں جس کے قدرتی حسن نے میرا دل موہ لیا۔

میں کبھی برما نہیں گیا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں اس بھول کی تلافی کر دوں گا اور اگر نصیب نے ساتھ دیا تو میں اسی سال

کے دوران میں وہاں جاؤں گا اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ اپنی عقیدت
کا اظہار کروں گا۔

۱۱ر مارچ سنہ ۱۹۳۷ء

ہندوستان اور چین

میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری بیماری نے مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے اور چینی ہال کے افتتاح کی تقریب کے موقع پر کل شانتی نکیتن میں حاضر ہونے سے معذور رکھا۔ عام طور پر میں بیمار نہیں پڑتا ——— اور اسی لئے میں نے خوشی سے اور پورے یقین کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس عظیم الشان تقریب میں شریک ہوں گا جس کی عظمت عہد رفتہ کی یاد تازہ کرتی ہے اور جس کی عظمت یہ اُمید دلاتی ہے کہ مستقبل میں بھی دوستانہ تعلقات باقی رہیں گے اور ایسے رشتے قائم ہوں گے جو ہندوستان اور چین کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیں۔ کیسا اچھا تھا وہ عہد رفتہ جو چین اور ہندوستان کے دوستانہ تعلقات کا گہوارہ رہ چکا ہے، اور جس میں سیاسی کش مکش اور جنگ جوئی نے کوئی فساد پیدا نہیں کیا تھا ہم خیالات کا، فنون کا، اور تہذیب کی دولت کا لین دین کرتے رہے، اور

دوسروں سے جو کچھ ہمیں حاصل ہوا اس سے اپنا ذخیرہ بڑھاتے رہے ہندوستان اور چین دونوں جگہ سیاسی محکومی، جمود اور تنزل کا دور آیا۔ مگر دونوں جگہ اس کی شکل مختلف تھی۔ اس دور کے ساتھ ہی نئی قوتیں اور نئے خیالات مغرب سے آئے جنھوں نے ہمیں اس بے حسی کے عالم سے ہوشیار کیا جس میں ہم مبتلا تھے۔ ہم زندگی میں ایک نیا توازن قائم کرنے اور اپنے آپ کو اِن ذلتوں کے پنجے سے جو ہمارا گلا گھونٹ رہی ہیں چھڑانے اور اپنی اس نئی زندگی کو جو ابھی سے ہماری رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ منظر عام پر لانے کے لئے جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ تمام دنیا اس نئے توازن کے لئے کوشاں ہے۔ مگر گمراہی کی قوتیں مضبوط ہیں اور فاشیت سامراج اور ان کے بھائی بندوں کے نام پر انسانی روح اور تمام آرٹ اور تمدن کو جو اس سے پھوٹتا ہے قربان کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن آدمیت کا یہ جوہر آسانی سے نہیں قربان کیا جا سکتا۔ وہ بہت سے وحشیانہ حملے برداشت کر چکا ہے اور نئے سرے سے وہی فتح پائے گا۔

چینی اور ہندوستانی دونوں قومیں آغاز تاریخ سے آپس میں ہنیں سمجھی جاتی ہیں وہ قدیم تمدنی روایات کی مالک ہیں اُن کے خیالات نے امن و عافیت میں نشوونما پائی ہے۔ انھیں دنیا کی اس کش مکش میں جس میں وہ خود بھی بہت زیادہ مبتلا ہیں نمایاں حصّہ لینا ہے۔ اس لئے یہ نہایت مناسب ہے کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔ ایک دوسرے کو از سر نو سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے ماضی و حال سے تقویت حاصل کریں۔ ضروری ہے کہ ملک کے تمدنی اور تصوراتی پس منظر کو اس کی بنیاد بنایا جائے۔ لہٰذا میں چینی ہال کے افتتاح کا خیر مقدم کرتا ہوں جو نہایت

مناسبت کے ساتھ شانتی نکیتن میں بنایا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور چین کی خوبیوں کے یک جا ہونے کے لئے یہ ایک واقعی جگہ ہوگی میں ان چینی علمار اور دوستوں کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہال کی عمارت مع اس کے کتب خانے کے تعمیر کرائی مجھے قوی امید ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات اس ہال کی وجہ سے برابر بڑھتے رہیں گے چینی علمار ہندوستان آئیں گے اور ہندوستان کے علمار چین جائیں گے اس طرح باہمی مفاہمت کی ایک ایسی راہ پڑ جائے گی جو ہم دونوں کو ان مسائل کا حل نکالنے میں مدد دے گی جن کا ہمیں مقابلہ رہتا ہے۔

۱۳ر اپریل ۱۹۳۷ء

برما کو خیرباد

برما کی عورتو اور مردو آپ حضرات نے اور ہندوستانیوں نے میرا استقبال نہایت شاندار طریقے سے کیا۔ میں انڈین نیشنل کانگریس اور اپنی قوم کی طرف سے خیرخواہی کا اظہار کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ آپ لوگوں سے بھی مجھے دوستی اور خیرخواہی کی اُمید تھی۔ آپ حضرات نے جس والہانہ انداز سے اپنی محبت کا اظہار میرے ساتھ کیا میں اس کے بوجھ سے دب گیا ہوں۔ اب رخصت ہوتے وقت مجھے آپ لوگوں کی اور ان عزیز دوستوں کی جدائی کا بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ جن سے ان انتہائی مصروفیت کے تیرہ دنوں میں ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ سرزمین پر لطف اور خوب صورت ہے۔ اور اس سے زیادہ خوش مزاج اور خوش گن یہاں کے رہنے والے ہیں۔ نوجوانوں کے چہرے چمکتے ہیں، عورتوں کی آنکھوں میں قہقہے کھیلتے ہیں۔ ہم ہندوستان والے جن پر ہمارے ہزاروں نامراد

لوگوں کے مستقبل کی ذمہ داری ہے، ایک زبردست بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اسقدر تکلیفوں مصیبتوں اور مشکلوں میں گھرے رہنے کے بعد ہمارے لئے مسکراتے رہنا آسان نہیں۔ میں جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تھکا ماندہ اور افسردہ خاطر تھا۔ لیکن آپ کے خوش کن جوش و خروش نے میری ساری افسردگی دور کردی اور میرے بوجھ کو ہلکا کردیا۔ آپ کی زبان سے زیادہ آپ کی آنکھوں نے ہماری دوستی کا یقین دلایا ہے۔ کون ہے جو اس اتحاد کو توڑنے کی جرات کرے؟ کون ہے جو یہ کہنے کی جسارت کرے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہیں؟

برما کی علیحدگی ہوچکی ہے۔ تو اس سے کیا ہوا؟ یہ ذرا سی چیز جو ہم پر غیر ملکی طاقت عائد کرتی ہے، کیا فرق ڈال سکتی ہے۔ ہمارے ان تعلقات میں جو ہمیں محسوس کرتے ہیں، ہمارے اُن تعلقات میں جو نہایت قدیم ہیں اور ہماری طبیعتوں میں رچے ہوئے ہیں۔ ہمارے اُن تعلقات میں جو آج آزادی کی مشترک جدوجہد اور باہمی ذاتی مفاد کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے ان شاندار تعلقات میں جن کے ساتھ ہماری مستقبل کی ساری اُمیدیں اور کامیابیاں وابستہ ہیں؟ ہندوستانی قوم جو دنیا کی قوموں میں قدیم ہے اب تک زندہ ہے، اور موجودہ زمانے میں اُن کے نوجوانوں کی قوت نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اپنی اس محکومی اور پستی کے زمانے میں بھی اُس نے غیر معمولی خوبیوں کے لڑکے اور لڑکیاں پیدا کی ہیں، جنھیں یہ اپنی بڑھیا ماں باوجود اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے بہت عزیز ہے۔ دو ہزار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا اس نے اپنی بہن برما کی سرزمین کو دو نہایت ہی گراں قدر

تحفے دیئے تھے۔ مدتوں بعد واقعات کے سلسلے نے ہم دونوں کو ایک ہی طرح کی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ہم دونوں محکوم ہو گئے اور ہم دونوں کو تکلیف اور رنج نے ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا۔ ہم دونوں تاریکی کے اس غار سے ساتھ ہی باہر بھی نکلیں گے۔

ہندوستانی بڑی تعداد میں آکر برما میں آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض خوش حال ہیں۔ لیکن بہت سے غریب لٹے ہوئے مزدور اور کسان ہیں۔ جن کی حالت برما کے مزدوروں اور کسانوں سے ملتی جلتی ہے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ دوسرے ہندوستانی عارضی طور پر یہاں رہتے ہیں۔ لیکن دونوں کو برما کی خوش حالی سے مسرت اور اس کی تکلیف سے دکھ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اُن کے مفاد اہل ملک کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان دونوں کے درمیان وقتی اختلافات کیسے؟

ہم ہندوستان میں اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق ہماری ذات سے ہو، ہندوستانی قوم کا مفاد مقدم رہنا چاہیے اور اس بات کا فیصلہ کرنے کا آخری حق اُنھی کا ہے کہ وہ مفاد کیا ہے۔ یہی صورت برما کے لئے بھی ہے۔ برمی عوام کے مفاد مقدم رہنے چاہئیں۔ اور اپنے مفاد کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کا حق انھیں ملنا چاہیے۔

دنیا میں آج انتشار پھیلا ہوا ہے اور ہم سب کو نہایت اہم مسائل سے سابقہ ہے۔ ہر جگہ کش مکش انتہا کو پہنچ رہی ہے اور تباہی کے بادل انق پر منڈلا رہے ہیں ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم ان مسائل سے کیسے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم اُنھیں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ہی نظرانداز

کرسکتے ہیں؟ چھوٹے آدمی اور چھوٹے ملک زندگی کی معمولی باتوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ اور جب بڑے حادثات ہوتے ہیں تو وہ ان میں گم ہوکر بہہ جاتے ہیں۔ لیکن عقل مند اور بہادر آدمیوں کی نظر دور تک دیکھتی ہے اور ہر بات کی تہہ تک پہنچتی ہے۔ وہ اپنے ملک کو ایک معینہ مقصد کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ مقصد ہمیں بلا رہا ہے مستقبل ہندوستان اور برما دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ کیا ہمیں اس آواز پر جواب نہ دینا چاہیے؟ اور باہم قدم اُٹھاتے ہوئے اور اُن آزمائشوں سے گذرتے ہوئے جو اس راستے میں پیش آئیں۔ اور ایک دوسرے کو تقویت دلاتے۔ حوصلہ افزائی کرتے اور اپنی قوم کے لئے آزادی حاصل کرتے آگے نہ بڑھنا چاہیے؟

حال اور ماضی کے عزیز ساتھیو، خدا حافظ۔ خدا کرے کہ آپ حضرات میرے لئے خوش قسمتی کا باعث ہوں اور ہم اس عزم، استقلال اور دور اندیشی سے کام کریں جس کی ہماری قوموں کو ہم سے توقع ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۳۷ء

آداب کا ایک سوال

مختلف وجوہات سے میں اخبارات کی دنیا میں خبروں کی پٹ سمجھا جاتا ہوں۔ اور اکثر میرے بارے میں کہانیاں تصنیف ہوتی رہتی ہیں بے شک ایک حد تک وہ لوگ جو پبلک معاملات میں حصّہ لیتے ہیں اگر عوام کی نگاہوں میں سما جائیں تو ایک مخصوص اخباری قدر کے مالک ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح میرے بھی اخبار نویسوں اور پریس والوں کی ایک بڑی تعداد سے تعلقات رہتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ میں ہمیشہ ان لوگوں کا لحاظ کرتا ہوں اور ان کے ساتھ مروت سے پیش آتا ہوں۔ غالباً انھیں ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ میرا ان سے کوئی گہرا تعلق ہے اور میں تو حقیقتاً یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا اُن سے ایک مخصوص رشتہ ہے اس لئے کہ مجھ میں کچھ اخبار نویس کی خو بو موجود ہے۔ یہاں ملایا میں بھی دوسرے مقامات کی طرح پریس نے میری ذات کے ساتھ اپنے شغف کا اظہار کیا ہے۔

مجھ پر کچھ تنقید بھی کی گئی ہے اور بعض اوقات میرے قول اور عمل کو لوگوں نے پسند بھی نہیں کیا ہے۔ میں اس طرف کسی جذبے کے تحت اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں تنقید کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ اس سے مجھے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ کسی سوال پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے سوچ سکوں، اور موجودہ زندگی کی پیچیدگیوں میں کوئی سیدھا ذہنی راستہ نکال سکوں اور اگر اخبارات تنقید نہ کریں تو پھر اور کون کرے گا؟ یہ تو پبلک پریس کا اولین فرض ہے۔ آج کل پریس کو پبلک معاملات میں زبردست اور اہم حصہ لینا پڑتا ہے۔

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں آدابِ مجلسی کا خیال نہیں رکھتا۔ مجھ میں اچھے اخلاق کی کمی ہے۔ اپنے میزبان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا ہوں اور وہ نہیں کرتا جو مجھے کرنا چاہیئے۔ میری حیثیت ان معاملات میں چونکہ لازمی طور پر ایک فریق کی سی ہے اس لئے میں کتنا ہی شخصیت سے آزاد ہو کر محض معروضی طور سے ان باتوں پر غور کرنے کی کوشش کروں مگر غیر شعوری طور پر میری طبیعت مجھے طرفداری کرنے پر آمادہ کر دے گی۔ تاہم میں اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لیتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور میرا عمل موزوں اور مناسب ہو۔ اگر متواتر جلسوں اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہے۔ جس کی وجہ سے مزاج میں اعتدال نہ رہے اور ایسی حالت میں مجھ سے کوئی نامناسب بات سرزد ہو جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں ایک عجیب اور غیر معمولی قسم کی زندگی گذارتا ہوں۔

میں کہاں تک ان مختلف گناہوں کا مرتکب ہوا ہوں؟ مجھے اس بات کی کرید ہے کہ یہ الزامات کس حد تک اس تعجب اور غرابت کا نتیجہ ہیں جو ملایا والوں کو میرے عمل اور قول سے محسوس ہوئی۔ میں ڈرائنگ روم کی خوش گوار مگر مصنوعی فضا میں کھیتوں، فیکٹریوں اور بازاروں کی گرد اپنے ساتھ لے کر داخل ہوا اور میری ہیئت اور میرا رویہ اس وقت ایسا نہ تھا جو ڈرائنگ روم کے تصور سے مناسبت رکھتا ہو۔ اور ملکوں میں ڈرائنگ روم اور امیرانہ خاطر تواضع ملکی زندگی پر حاوی نہیں ہے اور حقیقی دنیا جو ان چیزوں سے الگ ہے گویا دروازوں کو کھٹکھٹاتی رہتی ہے اور کبھی انھیں کھول کر اندر گھس آتی ہے۔ میں ملایا میں یہ ارادہ لے کر نہیں آیا تھا کہ وہاں میں جلسوں میں شریک ہوں گا اور تقریریں کروں گا۔ بلکہ میں اس ملک کے پرسکون مناظر سے لطف اندوز ہونا اور اطمینان سے خالی وقت گذارنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ارد گرد لوگوں کا اژدہام رہنے لگا۔ اور میرے دل نے ان کی مسرت بھری نگاہوں اور بے پایاں محبت کا خیر مقدم کیا۔ اور جو باتیں سننے کے لئے وہ بے چین تھے وہ میں نے انھیں سنا دی۔ میں نے انھیں ہندوستانیوں کی جد و جہد، اپنی امیدوں اور اندیشوں، اپنی نئی قوت اور خود اعتمادی کا حال سنایا اور انھیں بتلایا کہ ہم نے اپنی غربت اور بے روزگاری کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور ہماری بدنصیبی کی یہ لمبی راتیں کامیابی کی پو پھٹنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گی۔

لوگوں کا یہ ہجوم ڈرائنگ روم کے آداب کا عادی نہیں تھا۔ اور اگر جگہ کافی کشادہ نہ ہوتی تو بہت زیادہ گڑبڑ اور دھکم دھکا ہوتی جب میں نے اس انتشار کو رفع کرنے کے دوسرے طریقے اختیار کئے تو لوگوں کو یہ

خیال ہوا کہ مجھے غصہ آگیا ہے۔ انتشار کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں ایک میز پر کھڑا ہو گیا تاکہ لوگ مجھے دیکھ لیں یا بعض موقعوں پر لوگوں کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے میں مجمع کو چیرتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں بہت زیادہ بھیڑ تھی۔

میں نے ان معمولی باتوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ان کی تنقید دوسرے اور زیادہ اہم الزامات پر روشنی ڈالتی ہے۔ کوئی واقعہ ایسا ہوا کہ جو اخبار نویس وہاں موجود تھے اُن کے لئے عجیب تھا تو انھوں نے اس کا یا تو مطلب غلط نکالا یا اس پر خفا ہو گئے۔

یہی صورت میری تقریروں کی ہوئی۔ اخباروں کے نمایندے میرا مطلب صاف صاف نہ سمجھ سکے اس لئے انھوں نے رپورٹیں کبھی کبھی غلط لکھیں۔ خیر یہ تو معمولی بات ہے۔ اصل چیز یہ تھی کہ ان میں سے بہت سوں کو میرا نقطۂ نظر عجیب معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے غالباً اس کے متعلق سنا تو تھا لیکن وہ اسے کچھ زیادہ وقیع یا اہم نہیں سمجھتے تھے اور جب وہ اُن کے سامنے بغیر کسی بناوٹ کے ایک کھری بات کی شکل میں پیش کیا گیا تو بہت گھبرائے۔ انھوں نے مجھ سے سیدھے سیدھے سوالات کئے تو کیا میں انھیں سیدھے جواب نہ دیتا؟ سیدھا جواب نہ دینا اُن کے اور پبلک کے ساتھ گستاخی ہوتی۔

اپنی تقریروں میں میں نے جہاں تک ممکن تھا، علمی انداز سے ہندوستانی مسئلے پر بحث کرنے کی کوشش کی۔ میری زبان نہایت سادہ اور ایسے مجمع کے مطابق تھی جس میں بھانت بھانت کے لوگ شامل ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ نکتہ چین حضرات مجھے بتلاتے کہ میں نے کہاں پر غلطی کی تھی۔ یہ چیز مبہم

نکتہ چینی اور ناراضگی سے زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ کیا ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم مسائل کو سمجھیں تاکہ اُن کا حل سوچ سکیں۔ یا اُن سے بھاگیں اس لئے کہ ان سے دو چار ہونا ہمیں پسند نہیں ہے؟ برطانوی سامراج ہندوستان میں جو کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اس پر تنقید کرکے یہ بتلایا تھا کہ ہندوستانی قومیت آزادی کے لئے جد وجہد کررہی ہے اور یہی چیز ہماری آزادی کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اگر میں اس بات کو صاف نہ کرتا تو میرے لئے ہندوستان کے متعلق گفتگو کرنا بالکل بے معنی تھا۔ لوگ ہم سے خلاف کرسکتے ہیں۔ انھیں اس کا پورا پورا حق ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اہم اور ضروری حقائق کو اس لئے دبا لیا جائے کہ ان سے ڈرائنگ روم کے لوگوں کے نازک جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ کم از کم میں ان مشین صفت آدمیوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور جن کا کام حکام کی ہاں میں ہاں ملانا ہے۔ نہ خود کوئی ذمے دار حاکم اگر وہ بصیرت رکھتا ہے اور حقیقت کی روشنی میں چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے، ایسے لوگوں کی بہت زیادہ ہمت افزائی نہیں کرسکتا۔

لوگوں نے یہ پوچھا کہ کیا آپ برطانیہ کے خلاف ہیں، آپ اس کے خلاف ہیں۔ آپ اس کے خلاف ہیں؟ ایسے سوالات مجھ سے کئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ سوال کرنے والے اپنے زمانے کے مسائل کا کوئی اندازہ ہی نہیں رکھتے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم خالی مخالفت کی حد سے نکل چکے ہیں اور ہم اپنے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر زیادہ وسیع اور بنیادی طریقوں سے غور کرتے ہیں۔ میں برطانیہ کا مخالف کیوں ہوں اگر برطانیہ سے مراد برطانوی قوم ہے؟ میں نے اُن سے ذاتی طور پر بہت سی چیزیں

لی ہیں اور میں اُن کا احسان مند ہوں۔ مجھے اُن کی زبان اور ادب سے لگاؤ ہے۔ اُن میں سے بہت سے میرے دوست ہیں۔ لیکن میں سامراج اور سلطنت کا مخالف ہوں خواہ وہ کہیں بھی ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں دنیا کی ترقی کے راستے میں حائل ہیں۔

اگر ہم چیزوں کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی سمجھدار اور حساس آدمی مطمئن نہیں ہو سکتا تو ہمیں جہاں تک ہو سکے ٹھنڈے دل سے دنیا کے مسائل پر غور کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہیئے جو ان مسائل کا حل پیش کرتے ہوں یہ عجیب بات ہے کہ اور ملکوں سے زیادہ ملایا میں قدرتی وسائل کی فراوانی دیکھ کر مجھے دنیا کے غم کا احساس ہوا۔ اس لئے کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ ملایا دنیا کی قدرتی دولت کا نمونہ ہے۔ قدرت کے اس عظیم الشان ذخیرے سے جو اس نے ہمیں عطا کیا ہے اور سائنس اور صنعت و حرفت کے ذریعے اس ذخیرے سے نفع اُٹھانے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہوئے کیا ہم اپنی اس دنیا کو تمام لوگوں کے لئے جنت نہیں بنا سکتے؟ اور پھر بھی باوجود اس موجودہ قدرتی دولت کی کثرت اور مستقبل میں زیادہ ملنے کی توقع کے ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے ہیں اور آدمی آدمی کا اور قومیں قوموں کا گلا کاٹتی ہیں۔ اور بین الاقوامی مصیبتوں کا خوفناک منظر ہماری زندگیوں کو تاریک رکھتا ہے۔ لیکن وہ دن آئے گا جب ہم اس پیچیدہ بھول بھلیاں میں اپنا راستہ ڈھونڈھ

نکالیں گے اور ہم سب مل کر مشترک مفاد اور انسانی ترقی کے لئے کام کریں گے۔

یکم جون ۱۹۴۷ء

ملایا میں رہنے والے

ہندوستانی اور سیلونی

اکثر مجھ سے ان تعلقات کے بارے میں سوالات کئے گئے ہیں جو ملایا میں رہنے والے ہندوستانیوں اور سیلونیوں کے درمیان ہونے چاہئیں۔ اس معاملے کے متعلق حال ہی میں میرے ساتھ ایک انٹرویو کی کیفیت اخبارات میں آئی ہے جو ایک یا دو بیانات پر مشتمل ہے۔ یہ بیانات ایسے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع کے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کر دوں۔

جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا تعلق ہے میں قوم پرست ہوں لیکن دوسری قوموں سے تعلقات کے مسئلے کو میں قوم پرستی کے تنگ نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا۔ میری قوم پرستی خود بین الاقوامیت پر مبنی ہے۔ اور میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اس موجودہ دنیا کا دارومدار جو آج سائنس کی ایجادات، عالمگیر تجارت اور بار برداری کے نہایت تیز

ذرائع کی مالک ہے۔ بین الاقوامیت ہے کوئی ملک یا کوئی قوم اپنے آپ کو باقی دنیا سے علیحدہ نہیں رکھ سکتی اگر وہ اس کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتی ہے اور بالآخر اس کی کوشش کا ناکام ہونا ضروری ہے۔ میں تنگ نظر خودمختاری کا قائل نہیں لیکن جس بین الاقوامی اتحاد کا میں منتظر ہوں وہ یہ نہیں ہے کہ سب قومیں کسی ایک طاقت کی محکوم ہوں۔ بلکہ ہر قوم آزاد ہو اور وہ سب مل کر انسان کی بہبودی کے لئے کام کریں۔ یہی دنیا کا ایک ایسا نظام ہے جو امن قائم کرے گا اور انسانیت کو ابھارے گا۔

حالات نے ہم ہندوستانیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم قومی نقطۂ نظر سے سوچیں اور کام کریں۔ یہ چیز ہر ہندوستانی کے لئے خواہ وہ کہیں بھی رہتا ہو، ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ ہمارا بنیادی نصب العین قومی آزادی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اسی کے ساتھ ان کی ذہنیت بھی بین الاقوامی ہو جائے۔ اور وہ دوسرے ملکوں اور قوموں سے اپنے تعلقات بڑھائیں۔ ہمیں مستقبل میں ایک بڑا فرض انجام دینا ہے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیے۔

یہ تعلقات لازمی طور پر ان قوموں اور ملکوں کے ساتھ زیادہ وسیع ہوں گے جن سے ہمارا مفاد وابستہ ہوگا اور جن کی عالمگیر پالیسی بنیادی طور پر ہماری پالیسی سے میل کھاتی ہوگی۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ چین اور ہندوستان دونوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور ان دونوں کا آئندہ تعاون نہ صرف دونوں کے لئے مفید ہوگا بلکہ دنیا کو بھی بڑی حد تک فائدہ پہنچائے گا۔

اس لئے میں نے ان ہندوستانیوں کو جو ملایا میں رہتے ہیں اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ چینیوں اور ملایا والوں سے اور ان لوگوں سے جو ان ملکوں میں آباد ہیں زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔ سیلونی بہ نسبت کسی دوسری بیرونی قوم کے کئی اعتبار سے ہم سے بہت نزدیک ہیں۔ اس لئے یہ قدرتی بات ہے کہ ہمارا ان کا میل جول بہت گہرا ہوگا۔ اس معاملے میں جتنا تامل اور سنگھالیوں یا دوسرے سیلونیوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ ہندوستان کی حیثیت گذشتہ زمانے میں سیلون کے لئے بڑے بھائی کی سی رہی ہے۔

ہندوستان میں لوگوں کا یہی عام نظریہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ تعاون کو محکم اصولوں پر ڈھلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی بنیاد کسی مشترک پالیسی پر ہو۔ ایک ایسا تعاون جس میں محض ملازمتوں یا چند لوگوں کی استحقاقی برتری مقصود ہو تو وہ واقعی تعاون نہیں ہے یہ ایک طرح کی متحدہ بے ایمانی ہے اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کسی جماعت میں قوت خود اعتمادی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے سرکاری ملازمتوں کے حصول سے نہیں پیدا ہوتی اور سرکاری ملازمتیں بھی آخرکار انہی لوگوں کو ملتی ہیں جن میں قوت اور خود اعتمادی موجود ہو۔

تعاون دکھ سکھ دونوں میں ہونا چاہیئے۔ کسی کی خوش قسمتی میں حصہ بٹانا اور کسی کی بدقسمتی سے فائدہ اٹھانا، تعاون نہیں ہے۔ اس سے کوئی قوم نیک نام نہیں ہوتی۔

اگر اتحاد عمل کی اس مشترک بنیاد کو مان لیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا تو نہایت آسانی سے پورا پورا تعاون

ہوسکتا ہے۔

اس بات پر کچھ بحث رہی ہے کہ کیا سیلون تامل کو بھی ہندوستانیوں میں شامل کرنا چاہیئے؟ کچھ اسی قسم کا خیال ملایا میں ظاہر کیا گیا ہے۔ واقعتاً یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے اور اس سے سیلونیوں میں نفاق پیدا ہوتا ہے جو ٹھیک نہیں۔ اس لفظ کے سیاسی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ بات صریحی طور پر غلط معلوم ہوتی ہے لیکن سب سے اہم چیز یہ ہے کہ یہ خیال سیلونیوں میں ایک اختلاف کا جذبہ ابھار رہے گا جس کا ہمیں ساتھ نہ دینا چاہیئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سیلون کے لوگ اپنا مضبوط واحدہ بنالیں جو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور پورا پورا تعاون کرے۔ اگر کسی مقصد کے لئے ہندوستانی اور سیلونی باہم دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہم اس کا بھی اسی طرح خیر مقدم کریں گے جس طرح ہم کسی بڑھتی ہوئی برادری کا خیر مقدم کرتے۔ لیکن یہ بات نہایت ایمانداری سے ہونی چاہیئے اس میں کسی حیلہ یا کسی قانون کی بے تاویل کو دخل نہ ہونا چاہیئے اور ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم سب ہندوستانی اور سیلونی ہیں۔

جہاں تک ملک کے باشندوں کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ ان کا مفاد دوسروں کے مفاد سے مقدم ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر ہندوستانی یا اور دوسرے لوگ ملایا میں پیدا ہوئے ہیں اور اُسے اپنا گھر بنا لیا ہے تو کیوں ان کو ملک کا باشندہ نہ سمجھا جائے۔

۲ جون ۱۹۳۷ء

ملایا میں

ہندوستانی مزدور

جب میں ملایا کے ساحل پر اُترا تو سب سے پہلا سوال وہاں کے اخبار نویسوں نے مجھ سے ملایا میں رہنے والے ہندوستانی مزدوروں کے متعلق کیا۔ بار بار یہی سوال دہرایا گیا۔ یہ ایک نہایت معقول سوال تھا اس لئے کہ ملایا میں ہندوستانی مزدوروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور ان کی موجودہ حالت اور ان کا مستقبل جزیرہ نما ملایا اور ہندوستان دونوں جگہ کے رہنے والوں کی توجہ کا طالب ہے۔ میں نے سوال کا جواب نہیں دیا اس لئے کہ میں اس سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ میں نے خود ان مزدوروں کی حالت کا معائنہ نہیں کیا تھا اور نہ میں نے اُن کے متعلق کچھ زیادہ پڑھا تھا۔ حکومت کے لیبر ڈیپارٹمنٹ کے کچھ افسروں سے کئی جگہ میری ملاقات ہوئی انھوں نے میرے ساتھ اخلاق برتا اور جو مقام بھی میں دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے دکھا دیتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ عنایت کی کہ مجھے

گورنمنٹ کی تمام مطبوعات اور ملایا میں ہندوستانی مزدوروں کی حالت پر مسٹر ٹری نواس شاستری کی رپورٹ بھیج دی۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے لمبے چوڑے پروگرام کی باعث میں اس دوستانہ عنایتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور صرف پینگ اور سنگھا پور میں مزدوروں کی جھونپڑیاں ہی دیکھ سکا۔ ملایا میں میرے ملک کے بہت سے لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ میں بذاتِ خود مزدوروں کی حالت کا مطالعہ کروں۔

لهذا یہ میری خطا ہے کہ میں نے خود جاکر چیزوں کا معائنہ نہیں کیا ملایا کے لیبر ڈیپارٹمنٹ یا دوسرے دوستوں کی اس میں بالکل خطا نہیں اس لئے میں ہندوستانی مزدوروں کی واقعی حالت کے متعلق کوئی مستند بیان نہیں دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں خود جاکر ان کی حالت دیکھ بھی لیتا تب بھی میرا بیان مستند نہ ہوتا۔ کیونکہ اس مسئلے کے لئے عمیق مطالعے کی ضرورت تھی اور اسی بنیادی پہلو سے مجھے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے

مجھے کئی دفعہ لیبر ڈیپارٹمنٹ کے افسروں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مزدوروں کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بندرگاہ ڈکسن کی مختصر سے قیام میں میں نے اس موضوع پر کچھ مطبوعات کا مطالعہ بھی کیا جن میں مسٹر شاستری کی رپورٹ اور سنٹرل انڈیا ایسوسی ایشن کی روئیداد شامل ہیں۔ میں نے بہت سے ہندوستانی مزدوروں سے بھی ملاقات کی اور مختلف جلسوں میں مجھے اُن کے جتھے بھی نظر آئے۔

ان سب باتوں میں ان کی واقعی حالت اور دوسرے مخصوص مسائل کے متعلق جن پر بہت سی رپورٹوں میں بحث کی گئی ہے آخری رائے قائم

نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن مخصوص مسائل کے پردے میں بعض زیادہ قابل لحاظ امور ایسے تھے جن کے متعلق ایک اجنبی اور ناواقف آدمی بھی کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہیں رہتا۔

جب میں کسی ملک کے مزدوروں کی حالت کے متعلق غور کرتا ہوں تو پہلی چیز جو خود بخود میرے سامنے آتی ہے وہ مزدوروں کی تنظیم ہے یعنی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہاں، مزدوروں کی سبھائیں یا اُن کی تنظیم کی کوئی اور شکلیں ہیں؟ کیا وہ کم و بیش اپنے معاملات میں خودمختار ہیں، یا اُن کی حیثیت ایسی ہے جیسی کمپنی کی قائم کی ہوئی سبھاؤں کی۔ کیا ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مزدوروں کی حفاظت کرسکیں؟ اِس ذیل میں ملک کا قانون کیا ہے؟

مغربی صنعتی ممالک کے مزدوروں نے مدتوں کش مکش اور تکلیفوں کی زندگی گذارنے کے بعد جو بڑا سبق سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو منظم کیا جائے اور انجمنیں بنا کر اپنی قوت کو بڑھایا جائے۔ جب ہی یہ اُمید ہوسکتی ہے کہ ان کی ترقی اور اُن کے حقوق محفوظ رہیں۔ انہیں موجودہ سامراجی ڈھچر کی منظم طاقت کے خلاف لڑنا اور اس سے سودا کرنا پڑتا ہے۔ بے چارے غریب مزدور کو اس مقابلے میں کامیابی کی کیا اُمید ہوسکتی ہے جب تک کہ اس کی پشت پر تنظیم اور اتحاد نہ ہو؟ جب ہم مزدور سبھاؤں کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر اس سے ہمارا مطلب مزدوروں کی قائم کی ہوئی سبھائیں ہوتا ہے۔ لیکن تجارتی ایوانوں اور کارخانہ داروں کی انجمنیں اور دوسرے تاجروں کی سبھائیں اسی طرح پیشہ وروں کی سبھائیں ہیں جیسے کہ مزدوروں

کی سیمائیں۔ اُن کی پشت پر دولت کے بڑے بڑے ذخیرے اور اُن کے رکن تعلیم یافتہ اور سمجھدار لوگ ہوتے ہیں۔ اُنھیں عموماً حکومت کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور وہ یہ قدرت رکھتے ہیں کہ لوگوں کو برخاست کردینے کی دھمکی دے کر، جس کا نتیجہ مصیبت اور فاقہ ہوتا ہے، اپنی شرائط منوالیں۔ یہ بات انفرادی طور پر تاجروں کی اچھائی برائی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ ہمیں تو ان پر ایک ایسی جماعت یا ایسے طبقے کی حیثیت سے غور کرنا ہے جو لازمی طور پر اپنے گروہ کے فائدے کی فکر میں رہتا ہو۔ مزدوروں کی طاقتور سے طاقتور انجمنیں آجروں کی انجمنوں کا برابر کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ غیر منظم مزدور اُن کے سامنے بالکل بے دست و پا ہیں۔

ریاست (جس سے مراد ایک سرمایہ دار ریاست ہے) ایک حد تک مزدوروں کے مقصد کی حمایت اور کبھی کبھی ان کے حقوق کی حفاظت کرسکتی ہے۔ لیکن اگر مزدور خود ہی کمزور اور غیر منظم ہوں تو ریاست شاذو نادر ہی اُن کے لئے کچھ کرتی ہے۔ ریاست کے بہتر سے بہتر افسر جو ایمانداری سے مزدوروں کی بہبودی کے خواہش مند ہوں، اُن آجروں کی منظم قوت کا مقابلہ اور اس کی روک تھام کرنے سے قاصر رہیں گے، جو اکثر ریاست پر حاوی رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آجر اور سرمایہ دار ہی اصل میں ریاست ہیں۔ لیکن قطع نظر اس اثر اور اختیار کے جو اُنھیں براہ راست ریاست پر حاصل ہوتا ہے اور دوسری چیزیں بھی ہیں جو بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ مگر اہمیت میں کسی طرح کم نہیں ریاست کے اعلیٰ عہدے دار تعلیمی و معاشرتی، تمدنی اور معاشی

اعتبار سے اسی جماعت یا طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کو سرمائے اور مزدوری پر اختیار ہوتا ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اُن کے لئے زیادہ آسان یہ ہے کہ وہ اپنی جماعت کے مفاد کی فکر کریں۔

عرصہ ہوا کہ ڈزرائیلی نے امیروں اور غریبوں کی دنیا پر ایک مضمون لکھا تھا اور یہ دکھلایا تھا کہ وہ کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ان میں اتنی کم چیزیں مشترک ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس نے انیسویں صدی کے انگلستان کی انگریز قوم کی حالت پیش کی تھی۔ آج یہ چیز دوسرے ملکوں پر کتنی زیادہ صادق آتی ہے۔ اور جب اُس کے ساتھ نسلوں اور زبانوں کے اختلاف اور تمدنی پس منظر کو جو آپس میں بالکل میل نہیں کھاتا اور شامل کر دیا جائے تو ان دونوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ اور زیادہ وسیع ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ موجود رہے لیکن ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو محض عقلاً بھی سمجھنا ان دونوں کے لئے مشکل ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل ایک دوسرے کے جذبات و احساسات سے آگاہ ہونا ہے۔ یہی ایک ایسی صورت ہے جس کے ذریعے حقیقی سمجھوتہ ممکن ہو۔

اگر ریاست کی کوششیں کچھ مفید بھی ہوں جیسا کہ بعض اوقات ہوتی ہیں تو ان کی حیثیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ماں باپ اپنے بچوں پر مہربانی کرتے ہیں۔ اس سے نہ تو خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے اور نہ اندرونی قوت۔ کسی جماعت کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں خود اعتمادی کا جذبہ اُبھارا جائے، اس لئے مزدوروں کی فلاح کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ مزدور سبھائیں اور مزدوروں کی

دوسری انجمنوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس صورت میں ریاست ان مزدوروں کی مدد اس سے زیادہ کر سکتی ہے جتنی وہ کسی دوسری صورت میں کر سکتی۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس وقت ملایا میں بہت کم ایسی منظم جماعتیں ہیں جنھیں مزدور سبھائیں کہا جا سکے۔ مجھے یہ بتلایا گیا اور میں یہ سن کر خوش ہوا کہ لیبر ڈیپارٹمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ مزدور سبھائیں قائم ہوں۔ یہی بات مجھے اس گفتگو کے درمیان میں بتلائی گئی جو سنگاپور کے میونسپل مزدوروں کی گذشتہ سال کی ہڑتال کے متعلق لوگوں سے ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس ہڑتال میں لیبر ڈیپارٹمنٹ نے اُجرتوں کی اعلیٰ شرح کے مطالبہ میں ہڑتالیوں کی تائید کی تھی۔ ہڑتال ایک حد تک کامیاب ہوئی اور اُجرتوں کی شرح میں مطلوبہ اضافہ تو منظور نہیں ہوا لیکن اُجرتیں پہلے سے زیادہ کر دی گئیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لیبر ڈیپارٹمنٹ اب تک اس کی کوشش کر رہا ہے کہ میونسپل مزدوروں کے کام کی اُجرت بڑھا دی جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ ملایا میں مزدوروں کی انجمنوں کو آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

لیکن جب ہم مزدوروں اور اُن کے مستقبل کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے اصلی مراد ہماری کیا ہوتی ہے؟ کیا محض یہ کہ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو کم سے کم آرام اور اطمینان بہم پہنچا کر، قائم رکھا جائے۔ تاکہ اُن کے ذریعے صنعت کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہوتا رہے۔ لیکن خود ان کی حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو؟ یا ہمارا مدعا یہ ہوتا ہے کہ ہم ایسی تدبیریں سوچیں، جن سے وہ تعلیمی، تمدنی اور معاشی اعتبار سے بلند تر ہوتے چلے جائیں اور انھیں اس ملک کا جس میں وہ رہتے ہیں اور اس بڑی دنیا کا صحیح شہری بنایا جائے؟ یقیناً دوسری صورت اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے

اور اگر کوئی وسیع النظری سے کام لے تو یہی ایک ممکن راستہ ہے صنعت میں مشین سے کام لینے کا فن نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا ہو اور لوگوں کا معیار حیات بلند ہو جائے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس ترقی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے صنعتی ملکوں میں صنعت و حرفت بے روزگاری کے بڑھنے اور لوگوں کی قوت خرید گھٹ جانے کی وجہ سے شل ہو کر رہ گئی ہے۔ آدمی اور مشین دونوں کو ساتھ ساتھ ترقی کرنی چاہیے ورنہ دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

گذشتہ زمانے میں زندگی کی اچھی چیزوں کی اتنی کمی رہی کہ اشیاء کی کمیابی ہماری معاشی زندگی کی بنیاد بن گئی۔ جب چیزوں کی افراط کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی ہمارا عمل اور ہمارا خیال بدستور رہا۔ حتی کہ ضروریات کی چیزیں بہت بڑی تعداد میں ضائع کرتے اور ان کی پیداوار پر پابندی عائد کرتے رہے۔ تاکہ معاشی تنظیم ہمارے فرسودہ خیالات کے مطابق رہے یہ ایک ایسا حیرت انگیز منظر تھا جو صرف ہماری اُلٹی دنیا میں ممکن ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ کوشش بالکل حماقت آمیز تھی۔ اس لئے کہ ہماری زندگی کو اتنا ہی ترقی یافتہ ہونا چاہیے تھا۔ جتنا کہ سائنس، مشین اور اُن کے ناگزیر نتائج کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اس کے بعد پھر معاشی زندگی کا نظم بگڑ گیا۔ چیزیں بازار میں مانگ سے بہت زیادہ ہو گئیں اور بازار مندا پڑ گیا۔ اب ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم ان پیچیدگیوں سے باہر نکل آئے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ فراوانی کے دور اور کمیابی کے نظام معیشت کے درمیان کش مکش جاری ہے۔

بے ترتیبی کے اس ہنگامے میں اشتراکی ایک صاف اور اصولی راستہ نکال لیتے ہیں۔ یہ زمانہ افراط کا ہے۔ اس لئے وہ معاشیات کے ایسے اصول رائج کریں گے جو اس کے مناسب ہوں۔ وہ پیداوار کو ترقی دے کر اس کی انتہا تک پہنچا دیں گے اور دولت منافع اُٹھانے کے لئے نہیں بلکہ صرف کے لئے پیدا کریں گے۔ صنعت کا تمام منافع قوم کے پاس جائے گا تاکہ ملکی دولت کے ساتھ زندگی کا معیار بلند ہوتا چلا جائے۔ جس طرح آدمی کی ترقی اور نشوونما کی کوئی حد نہیں اسی طرح اس طریق کار کی بھی کوئی حد نہیں اس میں افراد کی اجارہ داری یک قلم موقوف کر دی جائے گی اور اُجرتوں اور تنخواہوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے گا کہ قوم کی قوت خرید اتنی بڑھ جائے کہ وہ پیدا کی ہوئی اشیا کو صرف کر سکے۔ اس طرح نہ تو بے روزگاری باقی رہ سکتی ہے اور نہ سرد بازاری۔

لیکن اشتراکیت ملایا کے لئے ایسی ہی ہے جیسے کوئی دور کی آواز لہذا ہمیں ایک معقول قسم کے سرمایہ داری نظام کو پیش نظر رکھ کر یہاں کی حالت پر غور کرنا چاہیئے، پریسیڈنٹ روز ویلٹ نے اس مصیبت کو دور کرنے کی کس طرح کوشش کی جو لوگوں کا گلا گھونٹ رہی تھی؟ اس نے تجارت اور صنعت میں جو بہت سست پڑ گئی تھی نئی جان ڈالنے کے لئے اُجرتوں کے بڑھانے اور کام کے گھنٹے کم کرنے پر زور دیا اور مزدور سبھاؤں کو تقویت پہنچائی اور انھیں حوصلہ دلایا کہ وہ براہ راست آجروں سے معاملہ کریں اُجرتوں کے بڑھنے سے عوام کی قوت خرید میں ایک نیا اضافہ ہو گیا کاروبار میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور صنعت کی گاڑی جو رک گئی تھی وہ پھر

دولت بھی بڑے پیمانے پر ہو۔ ایک کے بغیر دوسرا نہیں چل سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ بڑے پیمانے پر صرف دولت کے لئے عوام میں قوت خرید پیدا کرنی چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعت کو کہیں زیادہ منافع حاصل ہونے لگے گا۔

ملایا میں غالباً مزدوروں کی آبادی کو صرف کرنے والی جماعت نہیں سمجھا گیا۔ یہ بات آج ملایا کی اصلی صنعت وحرفت کی نوعیت اور دوسری صنعتوں کی کمی کی وجہ سے ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اگر نہایت غور سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ملایا کی خوش حالی اور دولت بہت زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر عوام کی قوت خرید کو برابر بڑھاتے چلے جائیں۔

خوش قسمتی سے ملایا کے ساتھ فطرت نے غیر معمولی فیاضی کا برتاؤ کیا ہے اور اب تک یہ ملک ان مصیبتوں میں مبتلا نہیں ہے جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں آخر ملایا کیوں یہاں کے رہنے والے لوگوں کو تعلیمی، تمدنی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اعلیٰ معیار پر لانے کے لئے قدرتی دولت سے فائدہ نہیں اُٹھاتا؟ اس قسم کی چیزوں میں جو محنت اور دولت لگائی جاتی ہے اس کا سوگنا ملک کو واپس مل جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس سے بہتر آدمی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر انگلستان اور فرانس میں زندگی کے یہی معیار ہوتے جو یہاں رائج ہیں اور ان کے پاس اتنی ہی قدرتی دولت ہوتی تو کیا وہ اپنے ملک والوں کے زندگی کے معیار بڑھانے اور عوام کا تعلیمی اور تمدنی معیار بلند کرنے میں اس دولت سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھاتے۔ کسی ملک کی حالت کا اندازہ چوٹی کے

چند لوگوں سے نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کی عام آبادی سے لگانا چاہئے ۔ کسی شہر کا اندازہ اس کے چند حصوں سے نہیں بلکہ اس کی گلیوں اور کوچوں سے لگتا ہے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اُجرتوں کی شرح کو جہاں تک ممکن ہو اونچا رکھنا چاہئے ۔ ایک ایسی شرح جو محض زندہ رکھ سکے کافی نہیں ۔ مزدور صنعت کی ترقی کے لئے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنے اہم ضرور ہیں جتنا کہ سرمایہ ۔ انھیں صنعت کی خوش حالی میں حصہ ملنا چاہئے اس لئے کہ جب کساد بازاری ہوتی ہے تو اُسے انھیں بھگتنا پڑتا ہے ۔ بہت سے ملکوں میں صنعتوں کی حالت خراب ہے اور انھیں مزدوروں کے معاوضے کا معیار بلند کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے ۔ لیکن ملایا جیسے خوش قسمت ملک میں یہ بات نہیں تو پھر کیوں نہ یہاں کے سب لوگ اور خصوصاً مزدور اور ملازم جن کی کوششوں سے دولت پیدا ہوتی ہے ۔ اس فراوانی سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں ؟ یہ انتہائی بدمعاملگی ہے کہ ضرورت سے زائد پیداوار کو محفوظ سرمائے اور غیر معمولی منافع میں تبدیل کر دیا جائے

مجھے معلوم نہیں کہ ۱۹۲۸ء کے اُجرتوں کے اعداد و شمار کو ہندوستانی مزدوروں کے لئے ایک طرح کا نمونۂ معیار کیوں سمجھ لیا گیا؟ آخر اس سال میں یا اُن اعداد و شمار میں ایسی کون سی خوبی پنہاں تھی ؟ میرے خیال میں تو صنعتوں کی موجودہ حالت بھی صریحی طور پر اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اجرتوں میں معقول اضافہ کر دیا جائے ۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ ہندوستانی مزدوروں کو چینیوں یا اور دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں کم اُجرت کیوں دی جائے ؟ علاوہ اور دوسرے قابل لحاظ اہم امور کے

جو ہندوستانی مزدور اور اس کے نسبتاً گرے ہوئے معیار زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔ اس مسئلے کے قومی پہلو بھی ہیں اور اس لحاظ سے ہندوستان کو معیار اور اُجرت کی شرح میں برابری کے حقوق کا مطالبہ ضرور کرنا چاہیئے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان میں اجرتیں اکثر اتنی نہیں دی جاتیں جتنی یہاں ادا کی جاتی ہیں (اگرچہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا) اس کے بہت سے ظاہر اسباب ہیں۔ مگر ان کے یہاں بیان کرنے ضرورت نہیں۔ لیکن کسی حالت میں بھی وہ یہاں ملایا میں اجرتوں کا پیمانہ کیوں ہوں؟ کیوں نہ ہم اجرتوں کے اس معیار کو جو انگلستان اور امریکہ میں رائج ہے پیمانے کے طور پر استعمال کریں؟ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو آدمی اپنا گھر چھوڑ کر باہر دوسرے ملک میں جاتا ہے۔ وہ زیادہ اُجرت کی توقع کرتا ہے۔ اور اُسے ضرورت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اس مسئلے کے خاص پہلوؤں کو چھوڑ دیجیئے تو بعض قابل لحاظ امور اور بھی ہیں، جو میرے نزدیک ملایا میں رہنے والے ہندوستانی مزدوروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہندوستانی مزدوروں کی حالت کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور معاشی نقطۂ نظر سے اُن کا جائزہ لیا جائے۔ اس قسم کی تحقیق میں خانہ فی بجٹ اور قرضوں کا پورا مسئلہ شامل ہونا چاہیئے۔

مزدوروں نے کام کرنے کے گھنٹوں کی تعداد کے مسئلے کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ مزدوروں کی تحریک کی تاریخ اس طویل جدو جہد کی ایک تاریخ ہے جس کا مقصد دنیا بھر میں یہ تھا کہ کام کرنے کے گھنٹے کم کرنے جاہیں

چنانچہ یہ بات اب اچھی طرح مان لی گئی ہے کہ کام کے لئے زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے روزانہ رکھنا مناسب ہے اور بعض ملکوں میں کام کا دن اس سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملایا میں بھی کام کا دن گھٹا کر آٹھ گھنٹے کر دینا نہایت مناسب ہوگا۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں کے علاقوں میں کارکردگی کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے تو تعلیم ایک نہایت اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ذیل میں بھی ترقی کے زبردست امکانات موجود ہیں اس لئے نہ صرف ابتدائی بلکہ ثانوی تعلیم کے لئے بھی پورے پورے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں۔

ہندوستان میں ہماری خواہش اور ہماری متعین پالیسی یہ ہے کہ شراب خواری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ محکمہ آبکاری سے جو آمدنی ہوتی ہے اُسے آسانی سے نہیں ترک کیا جا سکتا۔ لیکن یہ عذر ایک ایسی پالیسی کو تقویت پہنچاتا ہے جو مزدوروں کی قوت اور زندگی کا جوہر نچوڑ لیتی ہے۔ اور ان کی کارکردگی کو نقصان پہنچاتی ہے یہ خوف کہ سمسو شراب زیادہ بننے لگے گی ایک حد تک بجا ہوگا۔ لیکن اس وجہ سے موجودہ برائی کو جاری رہنے دینا یقیناً ٹھیک نہیں۔

ایک بات میں اور بتلا دینا چاہتا ہوں۔ میں شاستری کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مزدوروں کے بھرتی کرنے کا کنگنی طریقہ بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ میں نے اُس کی مخالفت میں تو بہت کچھ سنا ہے لیکن اس کی موافقت کرتے کسی کو نہیں سُنا۔

ملایا میں رہنے والے مزدوروں کے متعلق بہت سے ایسے

معاملات ہیں جن سے مجھے دلچسپی ہے لیکن یہ مضمون غیر ارادی طور پر بہت لمبا ہو گیا۔ اس لئے میں ان باتوں کو اس میں نہیں بڑھانا چاہتا۔ البتہ ایک بات ہے جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں۔ ہندوستان میں اگر کوئی قومی حکومت قائم ہوئی تو وہ بیرونی ممالک میں کام کرنے والے ہندوستانی مزدوروں سے بہت زیادہ دلچسپی لے گی۔ اسے اس لئے دلچسپی ہوگی کہ وہ اپنے ہم قوموں کے مفاد کی حفاظت کرے گی۔ اُسے اس لئے بھی دلچسپی ہوگی کہ وہ کسی ایسی شرط یا حیثیت کو منظور کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوگی، جس میں ہندوستانی قوم کی بے عزتی ہو۔

۳۱ رمئی ۱۹۳۶ء۔

ملایا میں رہنے والے
ہندوستانیوں کے نام

اس خوش منظر اور شاداب ملک میں، میں چند دن رہا۔ اس عرصے میں میں نے بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں اور مختلف معاملات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے ہندوستان کی موجودہ حالت اور جو کچھ ہم وہاں کر رہے ہیں اس کے متعلق لوگوں سے تبادلہ خیال کیا اور یہ بتلانے کی جرأت کی کہ ملایا میں ہندوستانی کیا کام کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میری تجویزیں لازمی طور پر مبہم ہیں، اور عام باتوں پر مبنی۔ اس لئے کہ خصوصی مسائل پر وہی شخص بحث کر سکتا ہے جو مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو۔ ملایا سے روانگی کے وقت جبکہ ریل ہمیں پینانگ سے جا رہی ہے۔ میں ان میں سے بعض تجویزوں کو زیادہ واضح شکل میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہاں کام کرنے والے ہندوستانی مزدوروں کی بابت میں الگ ایک مضمون لکھ چکا ہوں اور یہ خواہش ظاہر کر چکا ہوں کہ ہندوستانیوں

اور دوسرے لوگوں میں قریبی تعلق پیدا ہو جائے۔

ہندوستانیوں کو یہاں تین کام انجام دینے ہیں۔ یعنی تین قسم کی ذمے داریاں ہیں جو اُنھیں اُٹھانی ہیں۔ اول ہندوستان کی، دوسرے ملایا کی اور تیسرے اپنی ذات کی۔ یہ ذمے داریاں ایک دوسرے کو رد نہیں کرتیں، بلکہ ہر ایک، ایک دوسرے میں کسی حد تک شامل ہے اور ایک کے پورا کرنے سے دوسرے کے پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ہندوستان کی ان پر ذمے داری یہ ہے کہ وہ وہاں کے موجودہ واقعات سے گہرا تعلق رکھیں۔ ہماری آزادی کی جدوجہد میں صحیح معنی میں دلچسپی لیں۔ اور ایسے طریقوں سے ہندوستان کی مدد کریں جو اُن کے لئے ممکن ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ یہاں سے بیٹھ کر بہت کچھ نہیں کر سکتے لیکن اُنھیں اپنی خاطر اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ قومی ترقی کے دھاروں کے ساتھ چلیں اور اُن سے قوت اور زندگی حاصل کریں اگر وہ اس آنے والی کامیابی میں حصہ لینے کے خواہش مند ہوں، جیسا کہ انھیں ہونا چاہیئے تو انھیں کچھ ذمے داریوں کو اُٹھانے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ ان کا مستقبل آخر کار ہندوستان کے مستقبل سے بالکل وابستہ ہے۔ اس تعلق کو وہ توڑ نہیں سکتے اُن کی حیثیت، اُن کے حقوق کا تحفظ اور دنیا کی قوموں میں ان کی جگہ کا انحصار ہندوستان کی آزادی پر ہے۔ وہ کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟ روپے سے تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے قومی دن منا کر، کھدر پہن کر اور ہندوستانی تقریبوں کے موقعوں پر ہمارا قومی جھنڈا لہرا کر ہماری مدد کی جا سکتی ہے ملایا میں کھدر پہننے میں کفایت نہیں ہوگی۔ وہ یقیناً دوسرے کپڑوں

یا ریشم سے جو ملایا میں باہر سے آتا ہے زیادہ گراں ہوگا۔ لیکن وہ ہماری آزادی کی جدو جہد کا نشان اور جمہور سے ہمارے تعلق کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اور جو لوگ ارادۃً اسے استعمال کرتے ہیں وہ ہمارے ان دونوں نظریوں کے ساتھ جو حقیقت میں ایک ہیں۔ وفاداری ظاہر کرتے ہیں۔ اگر انھیں کھدر کے لئے کچھ زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے تو انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ روپئے زیادہ سے زیادہ ہندوستان کے غریب کاتنے اور بننے والوں کو ملتا ہے۔

تمام ہندوستانی یہ کرسکتے ہیں اور انھیں یہ کرنا چاہیئے خواہ وہ ملایا میں پیدا ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ اس لئے کہ ملایا میں پیدا ہونے والے ہندوستانی بھی دوسروں کی طرح ہندوستان ہی کے بچے ہیں انھیں بھی اسی طرح ہندوستان کی آزادی عزیز ہونی چاہیئے۔

ملایا میں اُن کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ اہل ملک کے ساتھ چینیوں کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جو یہاں رہتے ہیں، دوستی اور پورا پورا تعاون کریں۔ انھیں ملایا کے فائدے کو اپنا فائدہ سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ اُن کا وطن پیدائش کی وجہ سے یا اختیار کرلینے کی وجہ سے بن گیا ہے۔ انھیں اس ملک کی ترقی کے لئے ہر طرح کا کام کرنا چاہیئے۔ ہمارے عمل سے اہل ملک کو یہ بات محسوس ہونی چاہیئے کہ ہم وہاں اُن سے تعاون کرنے آئے ہیں۔ ان کے مفاد کو کسی صورت سے نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں۔ اگر ہندوستان ان کا اول محبوب ہے جو اپنے مقصد کے لئے، اُن سے وفاداری اور جاں نثاری کا مطالبہ کرتا ہے تو ملایا بھی انھیں اسی طرح عزیز ہے۔ یقیناً ہندوستان کی

یہ محبت ہی ان ملکوں اور یہاں کے بسنے والوں کے ساتھ دوستی کرنے میں ہندوستانیوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہندوستان کو ابتدائے تاریخ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اور ان کے مفاد بھی آپس میں بہت وابستہ ہیں۔

سب سے آخر میں خود اُن کی ذات ہے جس کی ذمے داری اُن پر ہے۔ انھیں دیکھ کر سب سے پہلا اثر جو مجھ پر ہوا وہ بہت اچھا نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہ الگ الگ اپنا کام کرتے ہیں۔ اگرچہ ان گروہوں میں آپس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن پھر بھی جماعت کمزور ہو جاتی ہے۔ قوت کے لئے ایسے اتحاد کی ضرورت ہے جو ان تمام گروہوں کو اپنے اندر شامل کرے جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہندوستانیوں کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ منظم ہو کر اس بڑے اتحاد کے لئے کام کریں اور جماعتی، سیاسی اور کاروباری تعلقات تمام ہندوستانیوں کے درمیان خواہ وہ ہندوستان کے کسی خطے کے رہنے والے ہوں بڑھائیں۔ جس حد تک وہ اس میں کامیاب ہوں گے اسی حد تک دوسرے ان کی عزت کریں گے۔ اور اہم معاملات میں اُن کی رائے وقعت رکھے گی۔

ملایا میں ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد مزدوروں کے طبقے سی تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے یہاں ہمارے مستقبل کا بہت زیادہ انحصار ملایا کے ہندوستانی مزدوروں کے مستقبل پر ہے۔ لہذا متوسط طبقے کے ہندوستانیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سی مزدوروں کی بہتری کی کوشش کریں اور اُن سے قریبی تعلق رکھیں۔ تاکہ وہ ان کی

اور ضرورتوں کو جانیں ، اور ان کی جد وجہد میں اُن کی امداد کرسکیں۔ میں نے کسی جگہ یہ کہا تھا کہ مزدوروں کی انجمنیں بنانا بہت مناسب ہوگا۔ شہروں میں اس چیز کا شروع کرنا کسی دوسری جگہ کی بہ نسبت زیادہ سہل ہے۔ دور اندیش آجروں کو ان انجمنوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس صورت میں انھیں بہ نسبت غیر منظم عوام کے مزدوروں کے منظم اور ذمہ دار گروہوں سے بات چیت اور معاملات کو طے کرنے ہوں گے ۔ ایسی انجمنوں کا حلقہ صرف ہندوستانی مزدوروں تک محدود نہ رہنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ مزدوروں کا مفاد نسلی نہیں ہوتا ۔ نسلی اعتبار سے یا خالص قومی نقطۂ نظر سے جو انجمنیں بنائی جائیں گی ، انھیں ایک دوسرے سے لڑا کر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے ۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو یہ انجمنیں ان تمام مزدوروں پر مشتمل ہونی چاہئیں جو ایک صنعت کا کام کرتے ہیں ۔

سب کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا اور طبی امداد کی آسانیاں بہم پہنچانا ، ریاست کا فرض ہے ۔ ملایا جیسے دولت مند ملک میں یہ چیز آسانی سے ممکن ہے ۔ چونکہ حالات ایسے ہی ہیں ۔ اس لئے ہمیں آپ اپنی مدد کرنی چاہیئے ۔ اگر ریاست فرائض انجام نہ دے ۔ اس لئے کہ کسی جماعت کے لئے تعلیم نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مستقبل کا تمام تر انحصار انھیں لوگوں پر ہوتا ہے جو اس ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور تربیت پاتے ہیں اس معاملے میں ملایا میں رہنے والے چینیوں نے جدید طرز کے بے شمار مدارس قائم کرکے ایک اچھی مثال پیش کی ہے ، کیوں نہ ہندوستانی ان کی پیروی کریں ؟ یہ بات ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے ۔ موجودہ سرکاری مدرسوں میں ہندوستانی زبانیں

نہیں سکھائی جائیں اور نہ ان میں درحقیقت ہندوستان کے لیے کوئی جگہ ہے (تھوڑی دیر کے لئے میں ان تامل مدرسوں کو خارج کئے دیتا ہوں جو ہندوستانی مزدوروں کے لئے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ہندوستان سے بالکل الگ ہوکر پرورش پاتے ہیں۔ اور ایک حد تک اُن کی ان کی قومی خصوصیت زائل ہو جاتی ہے۔ ہمارے اپنے مدارس میں۔ ہندوستانی" کو جو ہماری قومی زبان ہے اور طلبار کی مادری زبان کو اہمیت حاصل ہوگی۔ اس قسم کے مدارس کے متعلق میری تجویز یہ ہوگی کہ وہ تمام ہندوستانیوں کے لئے عام ہوں۔ کسی ایک مذہبی یا صوبجاتی فرقے تک محدود نہ رہیں۔ ہم اپنی تعلیم میں فرقہ بندی نہیں چاہتے۔ بے شک اگر ہمارے مدارس نہایت اچھے ہوئے اور انھوں نے غیر ہندوستانیوں کو بھی اپنی طرف راغب کرلیا تو میرا خیال ہے کہ ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

اس وقت جبکہ ابتدائی اور ثانوی مدرسے نہیں ہیں، کالجوں کی فکر کرنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم صرف مدرسوں کی تعلیم پر ختم نہیں کرسکتے مجھے حیرت ہے کہ باوجود دولت مند ہونے کے اس ملک میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں اس قدر محدود ہیں۔ سوائے ٹریننگ کالج اور میڈیکل کالج کے یہاں ایک یونیورسٹی بھی نہیں ہے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان یا کسی اور دوسرے ملک میں۔ لیکن ایک بڑی تعداد کے متعلق یہ توقع کرنا کہ اُسے دوسرے ملکوں میں جانے کا مقدور ہوگا، ایک لغویات ہے اس طرح عملاً اس ملک کے رہنے والوں کے لئے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ہندوستانی اس بات کے امکانات نہیں ہیں کہ وہ اپنی تعلیم آگے

جاری رکھ سکیں۔

عام تعلیم کے علاوہ ایک ایسے ملک کے لئے جہاں معدنی اور جنگلاتی ذرائع دولت کی افراط ہو، فنی اور سائنس کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وہ محض خام اشیاء پیدا کرنے والا ملک ہوکر رہ جائے گا اور مصنوعات تیار نہیں کر سکے گا۔ جیسی کہ ایک بڑی حد تک آج ملایا کی حالت ہے۔ مہارت طلب کام کے لئے، اُسے باہر کے لوگوں کی تلاش رہے گی۔ کسی ملک کے مستقبل کے لئے یہ حالت باعثِ ذلت ہے۔

اعلیٰ اور فنی تعلیم کا یہ سوال بے شک تمام ملایا والوں کے لئے ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف ہندوستانیوں ہی تک محدود نہیں ہے لیکن ہندوستانیوں کو اس پر غور کرنا چاہیئے اور اس عجیب و غریب کمی کو دور کرنے کے لئے دوسری جماعتوں سے تعاون کرنا چاہیئے، اس لئے کہ جدید ترقی کے واسطے یہ ایک ضروری شرط ہے۔

ایک چیز جس کی میں فوری ضرورت محسوس کرتا ہوں یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے لئے دارالمطالعے اور کتب خانے قائم کئے جائیں۔ جہاں ہندوستانی اخبارات، رسائل اور کتابوں کا انتظام ہو۔ ابتدا میں دارالمطالعے قائم کرنے چاہئیں، اس لئے کہ ان میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ اور آہستہ آہستہ اسی سلسلے میں کتب خانے قائم کردینے چاہئیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ کچھ ہندوستانی انجمنیں ہندوستان سے اخبارات منگاتی ہیں۔ مگر یہ بات کافی نہیں۔ دارالمطالعے عام ہونے چاہئیں، تاکہ سب لوگ وہاں آسکیں۔ ان میں غیر ہندوستانی بھی شامل ہوں جنھیں ہندوستان کے معاملات سے دلچسپی پیدا کرانی چاہیئے اس قسم کے دارالمطالعے

اور کتب خانے ہندوستانیوں کو جو ملایا میں آباد ہیں۔ ہندوستان کے روزمرہ کے واقعات سے باخبر رہنے میں مدد دیں گے۔

ملایا میں کچھ ایسے اخبارات بھی ہیں جن کے مالک ہندوستانی ہیں اور جو ہندوستان کے متعلق خبریں دیتے ہیں۔ ایسے اخبارات کو ہندوستانی زبانوں میں اور انگریزی میں نکلنا چاہیئے۔ اخبارات جماعت کے کان اور آواز ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر جماعت گونگی اور بہری ہوتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بے یار و مددگار ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اعلیٰ اور مستند اخبارات اور رسالے شائع کریں گے۔

میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ملایا میں رہنے والے ہندوستانی کھدر پہنیں۔ اس مقصد کے لئے کھدر کی دکانیں کھلنی چاہئیں جہاں سے اچھا اور قابلِ اعتبار کھدر مل سکے۔ اور ان لوگوں سے محفوظ رہے جو درمیان میں حد سے زیادہ نفع لے لیتے ہیں۔ آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن یا اس کی شاخوں سے اس بارے میں مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ کھدر کی ان دوکانوں میں کھدر کے علاوہ اور ہندوستانی چیزیں بھی رکھنی چاہئیں۔

یہ چند تجویزیں ہیں جو میں اپنے ملک کے مردوں اور عورتوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہندوستانی عورتوں کو ان معاملات میں نمایاں حصہ لینا چاہیئے۔ ہندوستان میں ہماری تحریک صرف مردوں ہی تک محدود نہیں ہے عورتوں نے بھی اس میں قابلِ ذکر حصہ لیا ہے۔ اور لے رہی ہیں۔

آخر میں میں اپنے تمام ملک والوں سے پھر یہی کہتا ہوں کہ اگر وہ یہ استحقاق اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے بچے کہلائے جائیں تو انھیں ان ذمے داریوں کے بوجھ کو ہٹانے کے لئے تیار رہنا چاہیے جو حقوق کا دوسرا پہلو ہیں۔ اس وسیع دنیا میں جہاں کہیں کوئی ہندوستانی جاتا ہے، اس کے ساتھ ایک لحاظ سے ہندوستان بھی جاتا ہے۔ اسے اس کو بھولنا یا نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے اعمال سے ہندوستان پرکھا جائے گا۔ ایک حد تک یہ بات اس کے اختیار میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کا اعتبار قائم کرے یا اُسے کھو دے۔ لوگ اس کے ملک کی عزت کریں یا اُسے ذلیل سمجھیں۔ اُسے ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے اور خواہ تکلیف میں ہو یا راحت میں، اپنی غیرت کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ ہندوستان چاہتا ہے کہ آزاد ہو اور دنیا سے دوستی رکھے۔ اسی کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں ہم کسی کے کرم کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم کسی ذلیل ملک کے رہنے والے نہیں بلکہ ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جو عزت والا ہے۔ وہ ایک شاندار ماضی کا مالک ہے، اور ہمیں امید ہے کہ اس کا مستقبل بھی شاندار ہوگا۔ یہی مستقبل ہم سب کو اپنی طرف بلاتا ہے کون اس پر لبیک نہیں کہے گا

۱۸ر جون ۱۹۳۷ء لندن

والیانِ ریاست اور وفاق

ہندوستان میں جدید دستور کے نفاذ کے فوراً ہی بعد دستوری جمود پیدا ہو گیا اور اس جمود نے بہت سے لوگوں کے سامنے نئے دستور کی اصل خصوصیات اس قدر واضح کر دیں کہ اگر دستور کی تشریح اور تجزیہ کیا جاتا تو اتنی وضاحت نہ پیدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دستور قانون کی کتاب میں کچھ دیر باقی رہے، اور برطانوی طاقت کی مدد سے نمائشی وزارتیں کام کرتی رہیں لیکن یہ سب کچھ اصلیت سے خالی ہے اور ایسا ہے جیسے بھوت پریت کی دنیا۔ البتہ آج جو چیز حقیقت رکھتی ہے وہ مقابلہ ہے جس میں ایک طرف برطانوی سامراج ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت جس کی نمایندگی کانگریس کر رہی ہے۔ اس مرقع میں اس ایکٹ کے لئے کوئی جگہ نہیں اور اسی لئے وہ ہاتھ لگاتے ہی بیٹھا پڑ رہا ہے لیکن ہمیں اسے ختم کرنے کی دونوں طرف سے کوشش کرنی چاہئے اور اس لئے

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ (اگر اس کا صوبجاتی پہلو بالکل نیست و نابود سمجھ لیا جائے) اس دستور کے وفاقی پہلو کا بھیانک چہرہ مستقبل کے پردے سے اب تک کھڑا جھانک رہا ہے۔ کانگریس نے ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ ہم اس وفاقی نظام کے خلاف لڑیں اور اس کو نافذ ہونے سے روکیں اس لئے کہ اس ایکٹ کا یہ وفاقی حصہ سب سے زیادہ مضرت رساں ہے۔

والیان ریاست کا کیا حال ہے؟ ہمیں مبہم خبریں اس بات کی ملی ہیں کہ ان میں سے بعض اس دستور سے اتفاق کرتے ہیں اور بعض مذبذب ہیں۔ ان والیان ریاست نے یا تقریباً ان میں سے سب نے قومی جدوجہد کے گذشتہ دور میں برطانوی سامراج کے مستعد اتحادی کی حیثیت سے کام کیا ہے قومی تحریک کے ساتھ اُن کا برتاؤ ہمیشہ اور ایک ہی طرح سے مخالفانہ رہا ہے۔ کیا اب بھی وہ اس وفاق میں، جس کی تمام سیاسی ہندوستان نے متحدہ طور پر مخالفت کی ہے شامل ہو کر اپنے ریکارڈ میں ایک اور مخالفانہ کارروائی کا اضافہ کرانا چاہتے ہیں؟ یہ فیصلہ اُن کے لئے نہایت اہم ہوگا۔ اور اس طرح وہ یہ ثابت کر دیں گے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ہندوستانی قوم کے مخالف ہیں۔ ریاستوں کی خود مختاری اور ان کے مخصوص عہد ناموں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے متعلق بہت کچھ گفتگو ہو رہی ہے۔ لیکن مستقبل میں وہ معاہدہ ہی قابل لحاظ ہوگا۔ جو ہندوستانی قوم دوسروں کے ساتھ کرے گی۔ یہ ایکٹ اپنے سینکڑوں ابواب، اپنے مخصوص اختیارات اور اپنے وفاق کے ساتھ لازمی طور پر ختم ہو جائے گا۔ اس لئے میں والیان ریاست سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس معاملے پر اس نقطۂ نظر

سے غور کریں اور اس راستے پر اندھا دھند نہ چل پڑیں جس پر ان
سے زیادہ عقل مند لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں

۳؍ مئی ۱۹۳۷ء

کانگریس اور مزدوروں اور کسانوں کی انجمنیں

جب سے میں برما اور ملایا کے سفر سے واپس آیا ہوں میرے پاس بہت سی کانگریس کمیٹیوں اور کانگریسیوں کے خط آچکے ہیں جن میں مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی انجمنوں کے سلسلے میں کانگریسیوں کا کیا فرض ہے۔ کیا ان انجمنوں کی ہمت افزائی کی جائے یا نہیں؟ اور اگر کی جائے تو ان انجمنوں کو کس قسم کا ہونا چاہیے؟ اور اگر کانگریس کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہو تو وہ کس قسم کا ہو؟ یہ مسائل بہت سے صوبوں میں پیدا ہوئے ہیں اور ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات یہ مسائل بڑی حد تک تلخی ہوتے ہیں اور بعض اوقات خاص طور سے صد بجاتی۔ لیکن ہمیشہ ان کے پیچھے بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے اس مسئلے کی مقامی نوعیت سے بحث کرتے وقت نہیں اس کی اور اس سے متعلق لوگوں کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا لازمی ہو جاتا ہے لیکن قبل اس کے

کہ ہم مقامی تفصیلات کی الجھنوں میں پڑیں ہمیں اپنے ذہن میں اصولوں اور حقیقی مسئلوں کو واضح کر لینا چاہیئے۔

یہ مسئلہ کس طرح پیدا ہوا ہے؟ یقیناً اس طرح نہیں کہ چند لوگوں نے ایک خاص طرز عمل اختیار کیا بلکہ اس سبب سے کہ وہ جدوجہد جس میں ہم سب مصروف ہیں خود ایک محرک قوت ہے۔ یہ ہماری ترقی اور جمہور کے بڑھتے ہوئے احساس کا نشان ہے۔ چونکہ اس ترقی کی اصلی ذمے دار کانگریس ہے لہذا اس بڑے پیمانے پر جمہور میں اس نئے احساس کی نشو ونما کا سہرا بھی کانگریس ہی کے سر ہے۔ کانگریس نے اس مقصد کے لئے کام کیا ہے۔ اگر اس سے کانگریس کو کامیابی حاصل ہو تو کانگریس والوں کو اس سے بچنا نہ چاہیئے۔ اس لئے اس نئی صورت حال کا ہمیں خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے کچھ پیچیدگیاں کیوں نہ پیدا ہو جائیں۔

ایک حد تک یہ پیچیدگیاں موجودہ صورتِ حال کے ساتھ لازمی ہیں کانگریس کے مقاصد پر سیاست غالب ہے۔ وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی آزادی کے ولولے کی ترجمانی کرتی ہے۔ کسانوں یا مزدوروں کی انجمن دراصل ایک خاص گروہ یا جماعت کی انجمن ہوتی ہے۔ جسے اور باتوں سے زیادہ اس طبقے یا گروہ کی بہبودی سے مطلب ہوتا ہے۔ کانگریس کے فکر و عمل کا میدان خاص طور سے سیاست ہے، مزدوروں کی انجمنوں کا میدان عمل پیشہ وروں کے حقوق و فرائض اور ان کی معیشت ہے۔ تاہم یہ اختلافات ایسے نہیں ہیں جیسے کہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری جدوجہد کی ترقی اور سیاسی شعور کی نشو ونما ان دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتی ہے، اور ان کے مقاصد مل کر بڑی حد تک ایک ہو جاتے

ہیں۔ کانگریس کا جمہور سے قریبی تعلق ہے اور وہی ملک میں جمہور کی سب سے بڑی انجمن ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کا فکر و عمل کسانوں اور دوسرے لوگوں کی معاشی شکایتوں اور تکلیفوں سے متاثر ہوتا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی انجمنیں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ معاشی خرابیوں کو کسی بڑی حد تک دور نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ سیاسی آزادی نہ حاصل ہو جائے اور بحیثیت مجموعی قوم کے ہاتھ میں قوت نہ آجائے۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے میں سمو جاتی ہیں اور سامراج کے خلاف متحدہ محاذ تیار ہو جاتا ہے۔

جب کوئی ملک کسی غیر ملکی اقتدار کے ماتحت ہوتا ہے تو وہاں معاملات کا سیاسی پہلو دوسرے تمام پہلوؤں پر حاوی رہتا ہے۔ صرف یہی بات کانگریس کو ملک کی سب سے مقتدر جماعت بنا دیتی، مگر پچھلے زمانے میں کانگریس نے ہماری آزادی کی جدوجہد میں جو کام کیا اس سے یہ اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اسطرح آج کانگریس اتنی طاقتور ہے اور اس کا نظام ملک میں اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی جماعت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا عوام کے دلوں پر زبردست اثر ہوتا ہے اور اسے ان کی اعانت حاصل ہے۔ مزدور اور کسان بھی اس کا احترام کرتے ہیں، اور بہ نسبت اپنی انجمنوں کے اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ کانگریس نے جمہور پر یہ اثر اور اُن کی اعانت محض اپنے سیاسی پروگرام کی وجہ سے حاصل نہیں کی۔ اُسے یہ چیز حاصل ہوئی ہے اپنی خدمات اور قربانی کے شاندار ریکارڈ کی بدولت، اور اس کی بدولت کہ وہ عوام سے براہِ راست تعلق رکھتی

ہے۔ اور اس کی بدولت کہ اس کے فکر و عمل پر معاشی اثر غالب ہوتا جا رہا ہے۔ اس معاشی نقطۂ نظر کو عوام سیاسی نصب العین کی بہ نسبت بہتر سمجھ سکتے ہیں اور اگر ہم اس تنظیمی اور بنیادی قوت کا جو کانگریس کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں حاصل ہے مقابلہ کریں تو نہایت دلچسپ نتائج نکلتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کانگریس کی قوت اسی نسبت سے بڑھتی ہے جس سے کہ اس مقاصد پر معاشیات کا اثر اور عوام سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

اس لئے ہماری آزادی کی جد و جہد کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ کانگریس کو سیاسی اور معاشی دونوں اعتبار سے تقویت پہنچائی جائے۔ ہر وہ چیز جو اسے کمزور کرتی ہے وہ نہ صرف ہماری جد و جہد کو کمزور کرتی ہے بلکہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کو بھی کمزور کرتی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ بغیر کانگریس کی امداد کے کچھ زیادہ ترقی کر سکے۔ اسی حقیقت کے احساس نے سارے ملک اور ہر قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کرایا ہے کہ کانگریس کی قیادت میں ایک مشترک سامراج دشمن محاذ قائم کیا جائے بیشک کانگریس خود زیادہ سے زیادہ اس متحدہ محاذ کے متعلق غور کر رہی ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود کانگریس ایک قومی انجمن ہے اور قومی انجمن ہی رہے گی۔ وہ ان اغراض کی نمائندگی نہیں کر سکتی جو مزدور اور کسان پیشہ وروں یا ایک طبقے کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ وہ مزدوروں یا کسانوں کی سبھا کی طرح کام نہیں کر سکتی۔ عملاً جہاں اس کا تعلق کسانوں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے وہ تقریباً اسی طرح کام کرتی ہے، جس طرح ایک کسان سبھا۔ بہر حال عام رجحان اس طرف ہے کہ کانگریس ایک ایسی انجمن بن جائے جس پر کسانوں کا غلبہ ہو، اور غالباً یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن اس کی قیادت لازمی طور پر

متوسط طبقے کے ہاتھ میں اور خصوصاً ادنیٰ متوسط طبقے کے ہاتھ میں اس وقت تک رہے گی جب تک کانگریس، نیشنل کانگریس ہے، اور اس میں کوئی ایسا انقلاب نہیں ہوتا جو اس کی کایا پلٹ دے۔

مگر یہ قیاس آرائیاں تو مستقبل سے متعلق ہیں اور ہمیں جس چیز سے بحث ہے وہ موجودہ دور ہے۔ موجودہ دور کے نمایاں حقائق یہ ہیں: (۱) کانگریس کو طاقتور بنایا جائے کیونکہ یہی ایک ایسی انجمن ہے جو موثر طریقے سے ہمیں ہمارے مقصد کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اور (۲) جمہور کے بڑھتے ہوئے احساس اور ہیجان کو تقویت بخشی جائے۔ اگر یہ دونوں حقائق ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں تو ہماری تحریک زور پکڑ جائے اور کامیابی کی طرف ہماری رہنمائی کرے۔ جمہور سے ربط بڑھانے پر کانگریس جو زور دیتی ہے اس تاکید کی علت نمائی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کا اطلاق ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب پر ہوتا ہے۔ مذاہب کا اختلاف اس پروگرام پر بالکل کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ بعض اوقات ہم غلطی سے مسلم جمہور سے ربط بڑھانے کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے جو صرف مسلمانوں سے بحث کرتی ہو۔ اس لحاظ سے ہمارا پروگرام ہندو مسلمان یا اور دوسروں کے لئے بالکل یکساں ہے۔ ہم مسلم جمہور سے اتحاد کا ذکر صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمارے کارکنوں کو ان میں کام کرنے کی طرف توجہ ہو۔

جمہور سے ربط بڑھانے کے دو طریقے ہیں۔ کانگریس کے اراکین اور گاؤں کی کمیٹیوں کے ذریعے براہ راست مزدوروں اور کسانوں سے ربط بڑھایا جائے، یا مزدوروں اور کسانوں کی انجمنوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں۔ پہلی صورت قطعی طور پر لازمی ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس کے

بغیر دوسری صورت بھی وقوع میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ دوسری صورت پہلی کا صرف ضمنی نتیجہ ہو سکتی ہے اگر کانگریس جمہور سے براہ راست گہرا تعلق پیدا نہیں کرتی تو لازمی طور پر وہ متوسط طبقے سے زیادہ متاثر ہوگی اور اس طرح ایک حد تک وہ عمومیت کے اس تصور سے ہٹ جائے گی جسے پیدا کرنا اس کا مستقل مقصد ہے۔ لہٰذا ہر کانگریسی کا یہی مقصد ہونا چاہیئے اور خصوصاً ان لوگوں کو جو مزدوروں اور کسانوں سے دلی تعلق رکھتے ہیں کہ وہ مزدوروں کے طبقوں سے کانگریس کے ممبر بنا کر اور گاؤں میں کانگریس کمیٹیاں قائم کرکے اس سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی اسکیم کو ترقی دیں۔

ربط بڑھانے کا دوسرا طریقہ یہی کہ کانگریس اور مزدوروں کی انجمنوں میں کسی طرح کا تنظیمی تعلق پیدا ہو جائے۔ جس کی بدولت مزدوروں کی بحیثیت پیشہ وراں کے نمائندگی ہونے لگے۔ ایسا مسئلہ ہے جس پر عرصے سے بحث ہو رہی ہے اور اب تک یہ بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے کانگریس کے دستور میں بنیادی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں اگر اس پر عمل ہوا بھی تو کب ہوگا۔ ذاتی طور پر میری یہ رائے ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے اور اس پر بتدریج اسی طرح عمل کیا جائے جیسا کہ صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے تجویز کیا ہے۔ شروع شروع میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اس لئے کہ کسانوں اور مزدوروں کی ایسی انجمنیں جو مناسب طور پر منظم ہوں اور کانگریس سے الحاق کی صلاحیت رکھتی ہوں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ اس کے علاوہ الحاق کی شرائط کانگریس کی طرف سے مقرر کی جائیں گی۔ لیکن یہ سوال اس وقت نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس لئے کہ کانگریس کا دستور اس قسم کے الحاق یا پیشہ وروں کی نمائندگی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور ہمیں یہاں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں اس بات

پر دو بارہ زور دینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو اس تبدیلی کی حمایت میں ہیں وہ اسے خارجی دباؤ کے ذریعے نہیں پیدا کر سکتے ۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ایسے مزدوروں اور کسانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس کا ممبر بنایا جائے جو یہ تبدیلی چاہتے ہیں ۔ اگر بیرونی اثر کسی وقت بھی اتنا زبردست ہو کہ وہ کانگریس کو اس کے ارادے کے خلاف جھکنے پر مجبور کر دے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ بیرونی ادارے کانگریس سے زیادہ طاقت ور ہیں ایسی حالت میں الحاق کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ لیکن یہ ایسی صورت ہے جس کے پیدا ہونے کا امکان بہت کم ہے ۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ یہ سوال اس وقت ہمارے دائرہ نظر سے باہر ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز جو کچھ کچھ اس سے مشابہ تمام ملک میں پیدا ہو رہی ہے ۔ یہ ہے وہ بڑھتا ہوا تعاون جو عملاً مقامی کانگریس کمیٹیوں اور مزدوروں کی انجمنوں میں نظر آ رہا ہے ۔ کبھی کبھی ان دونوں کی مشترک بے ضابطہ انجمنیں بھی بنی ہیں ۔ اکثر ان مقامی انجمنوں کے روح رواں ممتاز کانگریسی ہوتے ہیں اس لئے اس تعاون کے قائم ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ لیکن اس میں ایک چیز ایسی ہے جو اس درمیانی تعلق سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے ۔ اور وہ ہے اس تعاون کا مطالبہ اور اس حقیقت کا اعتراف کہ یہ تعاون نہایت ضروری

مزدوروں اور کسانوں کو براہ راست کانگریس میں داخل کرنے کی اہمیت پر زور دینے کے بعد اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ مزدوروں کے الگ ادارے ہونے چاہئیں یا نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی مزدوروں اور کسانوں دونوں کو یہ قدرتی حق ہے اور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو

منظم کریں۔ یہ ایک بنیادی حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے کانگریس نے بارہا تسلیم کیا ہے۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔ کانگریس ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے اور کم از کم نظری اعتبار سے اس نے ایسی انجمنوں کے قیام میں مدد دی ہے۔

صنعتی مزدوروں کا معاملہ کسانوں کے معاملے سے زیادہ صاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو کارخانے کے مزدوروں کے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے لامحالہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ان لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ انجمنیں قائم کر کے اپنی تنظیم کریں اور دوسرے لوگوں کو اس میں ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ مزدوروں کے اتحاد کی تحریک موجودہ صنعت کا ایک لازمی جزو ہے صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس تحریک کو بھی آگے بڑھنا چاہیئے۔ کانگریس اپنے اس نظریے کے باوجود کہ اسے جمہور سے ربط بڑھانا چاہیئے۔ مزدوروں کی انجمن کے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ مزدوروں کے متعدد مسائل اور جھگڑے جو آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں کسی مزدوروں کی انجمن ہی کے ذریعے طے پا سکتے ہیں۔ ہماری آزادی کی وسیع تحریک کے نقطہ نظر سے بھی مزدوروں کا انجمنیں بنا کر اپنی تنظیم کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس طرح کے منظم مزدور اپنے اندر طاقت، ترقی کی قوت اور اعلیٰ درجے کا سیاسی شعور پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کانگریسیوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے قیام میں مدد دینی چاہیئے۔ نیز مزدوروں کی آئے دن کی کش مکش میں بھی جہاں تک انھیں ضرورت ہو اُن کی امداد کرنی چاہیئے۔ مقامی کانگریس کمیٹیوں کو مقامی مزدوروں کی انجمنوں سے تعاون کرنا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ مزدوروں کی انجمن کسی طرح بھی کانگریس کے نظام میں شامل نہیں اور نہ وہ باضابطہ طریقے پر اس کے ماتحت ہیں۔

لیکن اس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سیاسی معاملات میں اُسے کانگریس کی رہنمائی میں چلنا چاہیئے اس کے سوا جو راستہ وہ اختیار کرے گی وہ آزادی کی جد و جہد کے ساتھ مزدوروں کی تحریک کے لئے بھی مضر ہو گا۔ معاشی معاملات میں اور ان معاملات میں جو مزدوروں کی تکالیف سے متعلق ہوں۔ مزدوروں کی انجمن جو پروگرام چاہے اپنے لئے تجویز کر سکتی ہے۔ خواہ وہ کانگریس کے پروگرام سے زیادہ ترقی پسند ہو۔ کانگریسی انفرادی طور سے ان انجمنوں کے رکن اور معاون ہو سکتے ہیں اور انھیں ہونا چاہیئے اور اس حیثیت سے وہ انھیں مشورہ دے سکتے ہیں۔ لیکن کسی کانگریسی کمیٹی کو بحیثیت کانگریس کمیٹی کے، مزدوروں کی انجمن کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ حال ہی میں مجھے یہ واقعہ معلوم ہوا ہے کہ ایک جگہ کی کانگریس کمیٹی نے مزدوروں کی ایک انجمن کی مجلس منتظمہ کے انتخابات کے موقع پر مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات میرے نزدیک بہت ناپسندیدہ ہے۔ ایسا کرنا کانگریس کمیٹی کی شان کے خلاف اور مزدوروں کی انجمن کے لئے برا ہے۔ اس سے یقینی طور پر جھگڑا پیدا ہونے اور مزدوروں کی انجمن کا کسی ایسی شکل میں تبدیل ہو جانے کا امکان ہے جو اصل میں مزدوروں کی انجمن نہ ہو۔ البتہ وہ کانگریسی جنھوں نے مزدوروں کے مفاد کے لئے کام کیا ہو انجمنوں کے معاملات میں حصہ لینے کا پورا حق رکھتے ہیں۔

ذرائع نقل و حمل میں کام کرنے والے بھی اسی صف میں ہیں جس میں کارخانے کے مزدور، انھیں بھی اپنی تنظیم کے لئے خاص طور سے انجمن بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ایک اچھی بات ہو گی اگر ان لوگوں کو جو شہروں میں اپنے مخصوص پیشوں کا کام کرتے ہیں اور جن کا معاشی مفاد مشترک ہے

مثلاً تانگے والے ٹھیلے والے، یکے والے، ملاح، (مچھیرے، کشتی بان) پتھر توڑ، معمولی کلرک، مطبعوں میں کام کرنے والے، مہتر اور اسی قسم کے دوسرے پیشہ وروں کو منظم کیا جائے، ظاہر ہے کہ ان سب کو کانگریس میں عام ممبروں کی حیثیت سے شامل کرنا چاہئے۔ لیکن ان کے بعض اپنے مخصوص مسائل ہیں اور پیشے کے اعتبار سے ان کی تنظیم، ان میں قوت اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرے گی۔ آگے چل کر اُن کے لئے کانگریس کے کام میں شریک ہونا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ ظاہر ہے یہاں ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ کانگریسی اُن کی خاص انجمنوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ضرورت کے وقت انھیں ہر قسم کی مدد دیتے ہیں۔

شہروں کے مزدوروں کی مشترک انجمنیں اور مزدور سبھائیں جن میں مختلف کاروبار کے مزدور شامل ہوتے ہیں، عام طور سے ناکام رہتی ہیں۔ اس لئے کہ ان میں پیشے کی وجہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ کوئی مشترک ضرورت یا عمل ایسا ہوتا ہے جو تعاون پیدا کر سکے۔ اور اگر اس سے مقصد سیاسی اتحاد ہے تو اس کے لئے کانگریس موجود ہے۔

اب اہم مسئلہ کسانوں کا رہ جاتا ہے اور ہمارے سب مسائل میں سب سے زیادہ اہم یہی ہے۔ کسانوں میں وہ کسان جو زمین کے مالک ہیں اور پنجاب یا کسی اور جگہ کے چھوٹے زمیندار، صوبجات متحدہ اور بہار کے اور بنگال اور اڑیسہ کے کرشک، شامل کرتا ہوں ان کے ساتھ سلوک کا ایک ہی طریقہ نہیں برتا جا سکتا اس میں حسب ضرورت تبدیلیاں ہوں گی۔ لیکن اس وقت میں صرف اس بات کو

لیتا ہوں کہ کانگریس کو اُن کے مخصوص اداروں سے کس قسم تعلق رکھنا چاہیئے۔

کانگریس نے پورے طور پر ان کا یہ حق تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں اور نظری اعتبار سے جو دلائل میں نے مزدوروں کی انجمنوں کی حمایت میں دیئے ہیں وہی اُن پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسانوں اور کارخانے کے مزدوروں میں فرق ہے۔ کارخانوں کے یا اسی اور قسم کے مزدوروں کو منظم کر لینا نسبتاً آسان ہے۔ ان میں آپس میں قریبی تعلق ہوتا ہے۔ وہ دوش بدوش کام کرتے ہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اُن کی تکالیف مشترک ہوتی ہیں۔ کسانوں کو منظم کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بالکل منتشر ہوتے ہیں اور ہمیشہ زندگی کو انفرادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کبھی اجتماعی نقطہ سے نہیں دیکھتے کانگریس کے کاموں کے ضمن میں ہمیں ان مشکلات کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ کانگریس کا کسانوں پر بہت اثر ہے، لیکن اُن کے منظم نہ ہونے کی وجہ سے کانگریس کو نسبتاً بہت کم تقویت پہنچی ہے۔ کروڑوں کسان کانگریس سے آس لگاتے ہیں اور اس کو اپنا سرپرست سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر اراکین کی تعداد دیکھئے تو صرف لاکھوں تک محدود ہے۔

جن دیہاتی علاقوں میں کانگریس کمیٹیاں موثر طریقے سے کام کر رہی ہیں۔ وہاں کسانوں کی سبھا قائم ہو تو تقریباً ایک سا کام کرنے کے لئے دو ادارے ہو جائیں گے۔ اس طرح ہر کام دو مختلف ذریعوں سے انجام پائے گا اور بہت قوت ضائع ہوگی۔ خود کانگریس کو کسان عام طور سے اپنی انجمن سمجھتے ہیں۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ ایسے علاقوں میں ہم یہ دیکھتے

ہیں کہ کسانوں کی انجمنیں پیدا نہیں ہوئیں۔ اگرچہ کسانوں کی تحریک کانگریسی تحریک کے ایک حصّے کی حیثیت سے خاصی طاقتور ہے اور اپنے آپ کو کانگریسی تحریک میں کم و بیش شامل سمجھتی ہے۔ لیکن جہاں کانگریس کمیٹیاں دیہات میں موثر طریقے سے کام نہیں کر رہی ہیں وہاں یہ خلا، جلد یا بدیر کسانوں کی انجمنیں پر کریں گی۔ سب سے اہم حقیقت جسے ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے وہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے کسانوں میں ایک زبردست ہیجان موجود ہے اور اپنی ان مصیبتوں سے جو بالکل ناقابل برداشت ہو چکی ہیں۔ نجات پانے کے لئے خود کچھ کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اُسے صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے ہیں ان کی بے چینی کے اسباب معاشی حالات ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہماری سیاسی تحریک نے جس کی قیادت کانگریس نے کی۔ جمہور میں احساس پیدا کر دیا ہے، اور انھیں ان بہت سی باتوں سے نفرت کرنا سکھا دیا ہے جو وہ بے زبان جانوروں کی طرح خاموشی سے برداشت کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے متحدہ عمل کی خوبی اور تنظیم کے اثر کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لی ہے۔ اس لئے وہ منتظر ہیں اور اگر کانگریس کی آواز اُن کے کانوں تک نہیں پہنچتی تو کسی دوسرے کی آواز پہنچے گی۔ اور وہ اس کا جواب دیں گے۔ لیکن ایسی بات جو اُن کے دلوں تک پہنچے وہ وہی ہو سکتی ہے جو اُن کی مصیبتوں اور ان مصیبتوں کے علاج سے متعلق ہو۔

ان سب باتوں کا نتیجہ ہے کہ آج بہت سے ایسے لوگ جنہیں اب سے پہلے کبھی کوئی مطلب کسانوں سے نہیں رہا، معاشی پروگرام کی فکر میں ہیں اور اپنے انوکھے طریقے سے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ کسانوں کو ایک لڑی میں منسلک کر دیں

حتیٰ کہ وہ لوگ جن پر سیاسی رجعت پسندی کا انتہائی رنگ غالب ہے مصنوعی جوش کے ساتھ۔ کسانوں کے پروگرام پر بحث کرتے ہیں۔ اس سے نہ کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے اس لئے کہ کسانوں کی دوررس اصلاح کا مقصد سیاسی رجعت پسندی کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن رجعت پسندوں کے اس رویے سے ہمیں ہوا کے رُخ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہ ہوا گاؤں اور مٹی کی جھونپڑیوں کی طرف جہاں غربت کے مارے کسان رہتے ہیں، چل رہی ہے، اور اگر بہت جلد انھیں اپنی مصیبتوں سے نجات نہ ملی تو قرین قیاس یہ ہے کہ وہ طوفان کی شکل اختیار کرلے گی۔ ہمارے تمام سیاسی مسائل اور سیاسی بحثیں اس ایک زبردست اور نمایاں مسئلہ یعنی مسئلہ زمین کے محض پس منظر ہیں۔
کانگریس نے بہت بڑی حد تک اس مسئلہ کا حل نکال لیا ہے اور باوجود اپنی سیاسی مشغولیت کے اس نے کسانوں کی اصلاح کا ایک پروگرام پیش کیا ہے۔ یہ پروگرام اگرچہ مسئلہ کی تہ تک نہیں پہنچتا، تاہم یہ ایک معقول اور دوررس پروگرام ہے اور یقیناً کسانوں کا بوجھ کچھ ہلکا کر دے گا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسانوں کی اصلاح کا پروگرام جو کسان سبھاؤں نے مرتب کیا ہے، اس ہمارے پروگرام سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن محض ایک نظری پروگرام سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن محض ایک نظری پروگرام مرتب کر لینا کافی نہیں ہے۔ اس کا کسانوں میں چرچا کرنا چاہیے اور کسانوں کی تنظیم گاؤں کو پیش نظر رکھ کر کی جانی چاہیے۔ پھر یہ کہ ہمیں اس پروگرام کی بنیاد پر ایسی اسکیمیں اور تجاویز مرتب کرنی چاہئیں۔ جو واضح اور معین ہوں۔ یہ تجاویز ہندوستان کے ہر حصے کے لئے مختلف ہوں گی

اس لئے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں ۔ یہ تجاویز مرتب کرنا صوبجاتی کانگریس کمیٹیوں اور مجلس قانون ساز کی کانگریس پارٹیوں کا کام ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ ہم اس پروگرام پر پوری طرح عمل کر سکیں ۔ لیکن ہمیں اسے ہر جزوی تفصیل کے ساتھ تیار رکھنا چاہیئے تاکہ جیسے ہی موقع ملے تو ہم یقین اور تیزی کے ساتھ کام شروع کر دیں ۔

میں یہ بتلا چکا ہوں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات اور زمانے کی محرک قوتیں کسانوں کی تنظیم کی صورت پیدا کر رہی ہیں ۔ دوسرے ملکوں کی مثال سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے ۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ لازمی طور پر کسانوں کی تنظیم کا کام بڑھے گا ۔ جہاں خود کانگریس میں کسانوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں الگ کسان سبھائیں اور اس قسم کی دوسری انجمنیں بحیثیت ایک انجمن کے موثر طریقے سے کام نہیں کر سکیں گی، خواہ وہ گاہے گاہے جلسے کر کے کسانوں کی تکالیف لوگوں کے سامنے پیش کرتی رہیں ۔ جہاں کانگریس کا تعلق گاؤں کے لوگوں سے کمزور ہے وہاں کسان سبھائیں ترقی کر جائیں گی ۔ بہر حال کسانوں کی انجمنیں خواہ وہ کمزور ہوں یا طاقتور ضرور پیدا ہوں گی ۔ ایسی صورت میں ہمارا رویہ ان کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے؟

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی کسانوں کی سبھا قائم نہ ہونی چاہئے ۔ کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا ہے یہ بات اس کے خلاف ہوگی اور اصولاً غلط ۔ اور اس کا اس زندہ تحریک اور ہیجان سے تصادم ہوگا جو ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں ۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسان سبھا کو محض کانگریس کا ایک بازو ہونا چاہیے یعنی کسان سبھا کا ہر ممبر کانگریس کا بھی ایک ابتدائی رکن ہو ۔ یہ بالکل ایک مہمل بات ہوگی

اس لئے کہ ان حالات کے ماتحت شاید ہی کسان سبھا کی ضرورت سمجھی جائے میرے نزدیک کسانوں کی انجمنوں کو آل انڈیا سپنرس ایسوسی ایشن یا ویلج انڈسٹریز ایسوسی ایشن جیسی انجمنوں کے زمرے میں بھی شمار کرنا خارج از بحث ہے۔ اس قسم کی پابندیاں کسانوں کی انجمنوں کے بڑھنے کو نہیں روک سکیں گی۔ اور ان کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ کسانوں کی انجمنیں کانگریس کے دائرے سے الگ ہو جائیں گی۔ اور اسے وہ ایسی جماعت سمجھنے لگیں گی جو ان سے کسی قدر عداوت رکھتی ہو۔

یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو اپنا رقیب نہ سمجھیں۔ یہ چیز دونوں کے لئے مضر ہوگی اور خاص طور سے کسانوں کی انجمن کے لئے زیادہ مضر ہوگی، کیونکہ وہ لازمی طور پر ہوگی اگر کسانوں کی بڑی تعداد براہِ راست کانگریس کی ممبر ہو اور کانگریس کے سربرآوردہ اراکین کسانوں کی تکالیف سے دلچسپی لیں تو کوئی رقابت پیدا نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کسانوں کی انجمن انتظامی اعتبار سے تو نہیں لیکن ویسے کانگریس کا ایک بازو بن جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے گول مول تعلقات میں بہت سی مشکلات ہیں اور تصادم کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ یہ مشکلات موجودہ صورت حال کا جزو لاینفک ہیں اور ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہماری سیاست جتنی زیادہ حقیقت پر مبنی ہوگی جتنی زیادہ وہ زندگی کے مسائل اور ایک عظیم الشان پیچیدہ اور ترقی کی قوت رکھنے والی تحریک کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہونے کی کوشش کرے گی اتنا ہی زیادہ ہمیں نئے نئے مسائل سے مقابلہ کرنا ہوگا، اور اپنے آپ کو بدلتے ہوئے

حالات کے مطابق بنانا ہوگا۔ اس لئے کہ خود زندگی بہت سے مختلف عناصر کا مرکب ہے اور ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے متعلق یا اور کسی موضوع کے متعلق جو رائے میں آج دوں ممکن ہے وہ کچھ عرصے بعد صحیح نہ رہے اس لئے کہ حالات بدل سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ اصول اچھے ہوں لیکن ان کو عملی جامہ پہنانا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہم آج یہ دیکھتے ہیں کہ کسان سبھا کے پلیٹ فارم کو کانگریس کی مخالفت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بعض اوقات وہ لوگ اس پلیٹ فارم کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو سیاسی یا فرقہ وارانہ اعتبار سے رجعت پسند ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کانگریسی جو مقامی کانگریس کمیٹی یا اس کے عہدے داروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کے لئے کسان سبھا کا پلیٹ فارم کانگریس کمیٹی اور اس کے عہدے داروں پر حملہ کرنے کے لئے ایک مناسب مقام ہوتا ہے۔ اس طرح خود کانگریس میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کانگریسیوں کی ایک ایسی جماعت جو دوسری جماعت کی مخالف ہو ایک غیر انجمن کے وجود سے غلط فائدہ اُٹھا سکتی ہے کسان سبھا کبھی ایسے کانگریسیوں کا عارضی ٹھکانا بن جاتی ہے، جو کانگریس سے انحراف کرتے ہیں یا ان لوگوں کا جن کے خلاف کانگریس نے تادیبی کارروائی کی ہو

مجھے ایسی کسان کانفرنسوں کے متعلق اطلاعیں ملی ہیں جو اسی علاقے میں دو میل کے اندر اندر منعقد ہوئیں جس میں ڈسٹرکٹ پولیٹیکل کانفرنس کا اجلاس ہو۔ یہ ارادتاً کیا گیا تھا۔ تاکہ کانگریس کو صدمہ ہو اور

کچھ لوگوں کو اس سے توڑلیں۔ مجھے اس کی بھی اطلاعیں ملی ہیں کہ کانگریس کی کانفرنسوں میں مداخلت کرنے کے لئے جلوس ترتیب دیئے گئے، اور ایسے نعرے لگائے گئے جو کانگریس والوں کو ناگوار گذریں۔

اس قسم کی چیز بے حد قابل اعتراض ہے تمام کانگریسیوں کو اس لغویت کی مخالفت کرنی چاہیئے اور کسی مخصوص جماعت یا افراد کے مفاد کی خاطر کسان تحریک سے نفع اٹھانے کی روش کو برا سمجھنا چاہیئے۔ دراصل اس سے کانگریس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ سوائے اس کے کہ بھولے بھالے اور ناتجربہ کار کسانوں کے خیالات پریشان ہو جاتے ہیں اس سے بہت زیادہ نقصان اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نے جھنڈے کے متعلق اوپر بھی کہا ہے اور یہاں بھی اُسے دہرا دینا چاہتا ہوں کہ قومی جھنڈے کو ذلیل کرنے کی کوشش خواہ وہ کوئی بھی کرے برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں سُرخ جھنڈے سے کوئی شکایت نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں مزدوروں کی جدوجہد اور قربانیوں کے نشان کی حیثیت سے اُسے پسند کرتا ہوں اور اس کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس جھنڈے کے لئے یہ بہت برا ہے کہ اُسے قومی جھنڈے کے مقابلے میں ایک قسم کے مخالف جھنڈے کی حیثیت دی جائے۔

نہ ہم یہ برداشت کرسکتے ہیں کہ کانگریس پر براہ راست حملے کئے جائیں اور تکلیف دہ نعرے لگائے جائیں جو لوگ یہ حرکتیں کرتے ہیں وہ اس مقصد کو سخت صدمہ پہنچاتے ہیں جس سے لگاؤ رکھنے کا انھیں دعویٰ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کانگریس کی پالیسی پر تنقید نہ کی جائے جو انجمنیں زندہ ہیں اور بڑھنے والی ہیں ان کے ارکین کے لئے

تنقید کی پوری آزادی ناگزیر ہے۔

اس قسم کے تمام واقعات کی نوعیت مقامی ہوتی ہے اور عام طور سے ان کا تعلق مقامی معاملات سے ہوتا ہے اس لئے ان کے متعلق مقامی طور پر کارروائی ہونی چاہیئے۔ یا اگر ضروری ہو تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ جب کہ کانگریسی کانگریس پر متواتر حملے کرتا رہے یا ایسے کاموں میں شریک ہو جو قطعی طور پر کانگریس کے کام اور اس کے وقار کے لئے، مضرت کا باعث ہوں تو اس کے معاملے کو انفرادی حیثیت دے کر اس پر غور کرنا چاہیئے اور اُسے صوبہ جاتی کانگریس کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس فیصلے کے لئے بھیج دینا چاہیئے۔

لیکن ہمیں زیادہ تر تعلق اُس مسئلے سے ہے جو ان معمولی باتوں سے بہت زیادہ اہم ہے۔ اس مخصوص مقامی حالات میں اُلجھ کر ہمیں اس سے غافل نہ ہو جانا چاہیئے۔ اس بڑے مسئلے کی راہ میں جو مشکلات آئیں اُن کا مقابلہ کرنے کے اور ان کا حل نکالنے کے لئے ہمیں کسانوں سے براہ راست ربط بڑھانا چاہیئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہم کسانوں کی انجمنوں سے دوستانہ تعلقات اور اتحادِ عمل پیدا کریں۔ نیز کانگریسیوں کو بہت بڑی تعداد میں اُن انجمنوں کا رکن ہونا چاہیئے۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دونوں جماعتوں کے درمیان رقابت کے احساس کو نہ بڑھنے دیں۔ جن اصولوں پر ہم چلتے ہیں وہ کافی واضح ہیں۔ لیکن آدمی کی طبیعت بھی اصول کے برابر اہمیت رکھتی ہے۔ اور اگر طبیعتوں کا اختلاف زیادہ نمایاں نہ ہو تو کم سے کم زحمت اور تصادم ہوگا۔

۲۸ جون ۱۹۳۶ء

دستوری جمود پر ایک نوٹ[1]

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا تیسرا حصّہ نافذ ہوا اور صوبجاتی خود مختاری کی وہ مشکل جو نئے دستور میں تجویز کی گئی تھی بر سرِ کار آئی۔ وہ پارٹیاں یا جماعتیں جنھیں صوبوں کی مجالس قانون ساز میں اکثریت حاصل تھی، تمام صوبوں میں اس ایکٹ کی شرائط کے مطابق حکومت کی ذمے داریاں سنبھالنے کا حق رکھتی تھیں۔ چھ صوبوں میں مجالس قانون ساز کی کانگریس پارٹیاں دوسری تمام پارٹیوں کے مقابلے میں قطعی طور پر اکثریت رکھتی تھیں۔ بعض صوبوں میں اُن کی اکثریت اتنی تھی کہ باقی پارٹیاں نظر انداز کی جا سکتی تھیں۔ جن چھ صوبوں میں (مدراس، صوبہ جات متحدہ

---

[1] یہ نوٹ نریندر دیو، کے ٹی شاہ اور جواہر لال نہرو تینوں نے مشترکہ طور پر اس سلسلۂ مضامین کے لئے لکھا ہے جو نیشنل پبلیکیشن سوسائٹی کی طرف سے شائع کئے گئے۔

بہار، بمبئی، صوبجاتِ متوسط، اور اڑیسہ) کانگریس پارٹیاں قطعی طور پر اکثریت میں تھیں۔ وہ برطانوی ہند کی دو تہائی آبادی پر مشتمل تھے۔ اس طرح ان چھ صوبوں میں ہدایات کانگریس کے اختیار میں تھی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو وزارتیں مرتب کرے۔ باقی صوبوں میں سے بہت سوں میں کانگریس دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد یا ایتلاف کر کے وزارت مرتب کر سکتی تھی۔

گذشتہ دو سال تک کانگریس کو عہدے قبول کرنے اور وزارتیں بنانے کے سوال نے بہت پریشان رکھا اور کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کا معاملہ متواتر ملتوی ہوتا رہا۔ عام انتخابات میں کانگریس کو نمایاں کامیابی حاصل ہو جانے اور نئے دستور کے افتتاح کا وقت قریب آ جانے کے بعد وزارتوں کے متعلق فیصلے کو زیادہ عرصے تک نہیں ٹالا جا سکتا تھا لہذا اس کام کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں دہلی میں ہوا اور آخر کار یہ فیصلہ ہو گیا کہ جن صوبوں کی مجالس قانون ساز میں کانگریس کی اکثریت ہے وہاں عہدے قبول کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک شرط لگا دی گئی۔ شرط یہ تھی کہ اگر صوبے کی مجلس قانون ساز کی کانگریس پارٹی کا لیڈر مطمئن ہو اور وہ یہ اعلان کر سکتا ہو کہ گورنر مداخلت کرنے کے اپنے مخصوص اختیارات استعمال نہیں کرے گا اور ان کاموں میں جو دستور نے وزیروں کے سپرد کیے ہیں اُن کے مشورے کو رد نہ کر دے گا تو کانگریسی وزارتیں بنا سکتے ہیں۔ آل انڈیا کنونشن نے جس میں مختلف صوبجاتی مجالس قانون ساز کے کانگریسی اراکین اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر شامل تھے،

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ فیصلہ منظور کر لیا۔

اس ہدایت کے مطابق کانگریس کمیٹی کے لیڈروں نے گورنروں سے جن کی دعوت پر وہ وزارتیں مرتب کرنے گئے تھے۔ اس بات کی ضمانت چاہی کہ وہ اپنے خاص اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن گورنروں نے انھیں اطمینان نہیں دلایا، اس لئے انھوں نے وزارتیں مرتب کرنے سے انکار کر دیا

اکثریت کی پارٹی نے چونکہ عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے ان چھ صوبوں میں جمود پیدا ہو گیا۔ گورنروں نے عارضی طور پر وزیر مقرر کئے۔ انھیں مجلس قانون ساز میں کسی کی تائید حاصل نہ تھی خود مجلس قانون ساز کے اجلاس بھی طلب نہیں کئے گئے۔ اس لئے کہ ان کا لازمی طور سے نتیجہ یہ ہوتا کہ عارضی وزرار علیحدہ کر دیے جاتے، اور جمود اور زیادہ بڑھ جاتا۔

اس کے بعد تین ماہ تک کانگریس اور برطانوی حکومت دونوں کی طرف سے اپنے اپنے نظریے کی تائید وصفائی میں بیانات شائع ہوتے رہے بحث اکثر قانونی اور دستوری اصطلاحات میں کی جاتی تھی۔ لیکن اصل اختلاف زیادہ گہرا تھا۔ اس نے برطانوی سامراج اور ہندوستانی قوم کی آزاد ہونے کی خواہش کے درمیان جو دشمنی تھی اُسے ظاہر کر دیا۔ گورنروں نے اس بات کا وعدہ لینے میں کہ وہ اپنے مداخلت کے اختیارات خصوصی استعمال نہیں کریں گے، کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ جانبین میں ایک قسم کا سمجھوتہ ہو جائے تاکہ وزرار کی رائے ان مخصوص اختیارات پر بھی بھاری رہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایکٹ کی حدود کے اندر رہ کر بغیر روک ٹوک کے صوبجاتی حکومت چلائی

جا سکے۔

اس ایکٹ کی رو سے گورنروں کے اختیارات و فرائض تین قسم کے ہیں :-

۱۔ وہ جنھیں گورنر کلیتہً اپنے اختیار تمیزی سے استعمال کر سکے۔
۲۔ وہ جن کے استعمال میں وہ اپنی ذاتی قوت فیصلہ سے کام لے۔ اور
۳۔ وہ جن میں وزرا کی رائے پر عمل کرنا اس کے لئے لازمی ہے۔

کانگریس جو وعدے گورنروں سے لینا چاہتی تھی وہ پہلے گو اختیارات سے متعلق تھے۔ ان میں سے پہلے اختیار کے مطابق گورنر اگر نہ چاہے تو اپنے وزیروں سے مشورہ تک کرنا اس کے لئے ضروری نہیں اور وہ بالکل اپنی ذمہ داری پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے میں کچھ پابندیاں گورنروں پر عائد کی گئی ہیں جن میں اسے اپنی ذاتی قوت فیصلہ استعمال کرنی چاہیے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے وہ اپنے وزیروں سے مشورہ کرنے پر مجبور ہے اگر وزراء کی رائے اس کے لئے قابل قبول نہ ہو تو وہ اُسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان معاملات کی فہرست جن میں گورنر کو اپنی قوت فیصلہ استعمال کرنے کا اختیار ہے، نہایت مرعوب کن ہے۔ کانگریس نے اس صورت حال کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے گورنروں سے وعدے چاہے تھے۔ تاکہ صدیوں کی حکومت میں رکاوٹیں اور بار بار جمود کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

برطانوی حکومت کی طرف سے یہ بیان دیا گیا کہ اس قسم کے وعدے ایکٹ کی خلاف ورزی کئے بغیر نہیں کئے جا سکتے۔ کانگریسی لیڈروں نے کہا کہ ہم تو اس سارے ایکٹ ہی کے مخالف ہیں۔ اس لئے ان وعدوں

کے مطالبے سے ہماری غرض ایکٹ میں ترمیم کرانا نہیں ہے۔ اس قسم کے وعدے تو ایکٹ کی حدود ہی میں رہ کر کئے جاسکتے ہیں۔ جہاں گورنر کی اختیار تمیزی استعمال کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ وہاں یقیناً وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ اسے اپنے وزراء کے رائے کی موافقت میں استعمال کرے۔ اور اس بارے میں وہ وعدہ بھی کرسکتا ہے۔ ایکٹ میں گورنر کو کہیں بھی اس بات سے نہیں روکا گیا ہے کہ وہ اپنا اختیار تمیزی اپنے وزراء کے رائے کی موافقت میں استعمال نہ کرے۔

کیونکہ اس بحث نے یہ قانونی شکل اختیار کرلی تھی کہ آیا مطلوبہ وعدے اس ایکٹ کے ماتحت کئے جاسکتے ہیں یا نہیں اس لئے مہاتما گاندھی نے کانگریس کی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ اس معاملے کے فیصلے کے لئے ایک غیر جانب دار پنچایت کے سپرد کردیا جائے۔ یہ تجویز برطانوی حکومت نے منظور نہیں کی اور نہ ایکٹ کی دفعہ ۱۹۳ سے اس معاملے کو سلجھانے میں کوئی مدد لی گئی۔ حالانکہ یہ دفعہ خاص طور سے اسی لئے رکھی گئی تھی کہ تغیر و تبدل کے زمانے میں امکانی مشکلات پر اس کے ذریعے قابو پایا جاسکے۔

جوں جوں بحث بڑھتی گئی وعدوں کا اصلی مطالبہ جو کانگریس کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ تاویلات کی وجہ سے ہلکا ہوتا گیا۔ برطانوی حکومت نے بھی آہستہ آہستہ اپنی بحث کی بنیاد کو بدلا اور آخر کار اس نظریے کا اظہار کیا کہ اگرچہ کوئی قطعی وعدہ کانگریس کی تجویز کے مطابق نہیں کیا جاسکتا لیکن صوبجاتی خودمختاری کا لب لباب جیسا کہ نئے ایکٹ میں بتایا گیا ہے یہ ہے کہ گورنر اپنے وزراء کا تعاون حاصل کرے۔

عارضی وزرار کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جارہی تھی۔ وہ حد سے زیادہ غیر ہر دلعزیز تھے۔ اُن کے پیچھے سوائے گورنر کی مرضی کے اور کوئی قاعدہ قانون نہ تھا۔ چونکہ وہ مجلس قانون ساز کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے منتخب ممبروں کے متواتر تقاضوں کے باوجود مجلس کا جلسہ نہیں طلب کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صوبجاتی خود مختاری محض گڑیوں کا ایک تماشہ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ظاہر تھا کہ یہ حالات بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے تھے اس لئے کہ مجلس قانون ساز کا چھ مہینے کے اندر اندر جلسہ کرنا اور میزانیہ منظور کرنا ضروری تھا یہی وہ زبردست ہنگامہ تھا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ دینے پر راضی ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ وائسرائے نے اشارۃً یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کانگریس پارٹیاں عہدے قبول کرنے سے انکار کرتی رہیں تو ان کے صوبوں میں جہاں کانگریس کی اکثریت ہوئی اس ایکٹ کو اس کی دفعہ ۹۳ کے مطابق معطل کر دیا جائے گا۔

اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس نے کابینہ کی ذمے داریاں قبول کر لینے کی اجازت دے دی۔ اور یہ اعلان کیا کہ اگرچہ برطانوی حکومت کے اعلانات سے اس بات کا پتہ چلتا ہی کہ وہ کانگریس کے مطالبے کو منظور کرنے کی صورت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشن کے بموجب برطانوی حکومت کو جتنا اطمینان دلانا چاہئے تھا اس سے یہ بہت کم تھے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ شرکت کا جو اصول مذکورہ اعلانات میں پیش کیا گیا ہے، کانگریس اس کی تائید

کرنے سے ناصر ہے۔ برطانوی حکومت اور ہندوستان کے درمیان جو تعلقات ہیں ان کی صحیح تعریف یہ ہے کہ برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لئے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو اپنا آلہ کار بناتی ہے۔ اور اسی لئے وہ ہر نہایت اہم مسئلے کے بارے میں مختلف نظرئے رکھتے ہیں۔ بہر حال کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ جو صورتِ حال حالات کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے اور جو واقعات کانگریس کا مطالبہ پیش کرنے کے بعد سے رونما ہوئے ہیں وہ اس یقین کی تصدیق کرتے ہیں کہ گورنروں کے لئے اپنے اختیاراتِ خصوصی استعمال کرنا آسان نہ ہوگا اس لئے کمیٹی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ جہاں کانگریسیوں کو وزارت قائم کرنے کی دعوت دی جائے وہاں وہ قبول کریں۔ لیکن ریزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی نے اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ اس کی یہ خواہش ہے کہ وزارت اس خیال سے منظور کی جائے کہ حکومت کا کام کانگریس کے انتخابی منشور کے مطابق کیا جائے گا۔ اور اس کے لئے موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے گا اور کانگریس کی جو پالیسی ہے کہ ایک طرف نئے ایکٹ کی مخالفت کی جائے اور دوسری طرف تعمیری کام جاری رکھا جائے۔ اس کو ہر لحاظ سے ترقی دی جائے گی۔

مجلس عاملہ کی اس تجویز کے بعد چند دن کے اندر اندر کانگریس پارٹی کے لیڈر مذکورہ چھ صوبوں میں کابینے مرتب کرنے کے لئے بلائے گئے اور انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی اس طرح دستوری جمود کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اڑیسہ، صوبجات متوسط، بہار، بمبئی، صوبجات متحدہ اور مدراس میں کانگریس کے کابینے مرتب ہو گئے۔

جولائی ۱۹۳۷ء

عہدے قبول کرنے کا فیصلہ

(۱)

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ختم ہونے کے فوراً ہی بعد جلد باز اخبار نویس حضرات کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ورکنگ کمیٹی نے عہدوں کے قبول کرنے کے بارے میں جو تجویز منظور کی ہے، اس کے متعلق میں اپنی رائے دوں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ ورکنگ کمیٹی کے اراکین کمیٹی کی تجویزوں پر بحث نہیں کرتے۔ پھر مذاق میں میں نے یہ بھی کہا کہ ورکنگ کمیٹی کے رکن کی نظر میں، ورکنگ کمیٹی کی تجویز بالکل صحیح ہونی چاہیے۔ کیونکہ جبتک وہ اس مجلس کا ایک رکن ہے اس کے لئے ورکنگ کمیٹی کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہے جس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔

لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح مذاق میں، میں اس سوال

کو طے نہیں کر سکتا۔ اور مجھے اپنے کانگریسی رفقاء کو اس تجویز کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دو یا تین سال سے عہدے قبول کرنے کے موضوع پر ملک میں زبردست قسم کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ افراد نے بھی اس بحث میں حصہ لیا ہے اور جماعتوں نے بھی۔ اور ہر ایک نہایت مضبوطی سے اپنے نقطۂ نظر پر جما ہوا ہے۔ یہ خیالات قریب قریب ایک ہی سے تھے۔ لیکن ان خیالات کے پیچھے کیا چیز کام کر رہی تھی؟ میں سمجھتا ہوں کہ بہت تھوڑے ایسے لوگ تھے جو اصولاً عہدے قبول کرنے کے خلاف تھے۔ ورنہ ان لوگوں نے بھی جو انقلابی تبدیلیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ نہ سوچا کہ عہدے قبول کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھانا لازمی طور پر اور ہر حالت میں غلط ہے۔ ان لوگوں کو اور ان کے ساتھ اور بہت سے حضرات کو یہ ڈر تھا کہ عہدوں کو قبول کرنے میں یہ بہت بڑا خطرہ ہے کہ ہم چھوٹے موٹے اصلاحی منصوبوں میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ اور تھوڑے عرصے کے لئے اپنے اصل معاملے کو بھول جائیں گے۔ انھیں یہ بھی خطرہ تھا کہ قانون سازی کا حق جمہور کے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور ہماری جار و بہار کونسل چیمبر میں محدود رہے گی۔ جہاں دم گھٹتا ہے اور نظر محدود ہو جاتی ہے یہی وہ خطرہ تھا جس نے کانگریس، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کو بار بار اس کا اعادہ کرنے پر مجبور کیا کہ ہمارا سب سے اہم کام مجالس قانون ساز کے باہر جمہور کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں وابستہ ہے اگر ہم آگے اور اپنے آزادی کے نصب العین کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اس کے لئے آخر تک کام کریں تو یہ خطرہ کم ہو جاتا ہے اور ہم مجالس قانون ساز کو بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ورکنگ کمیٹی نے جو تجویز وردھا میں منظور کی تھی، وہ موجودہ کانگریس کی اکثریت کی رائے کو ظاہر کرتی ہے یہ رائے عہدے قبول کرنے کی حامی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ متحدہ طور پر اور شدت سے کانگریس کی اس بنیادی پالیسی کی حامی ہے کہ نئے دستور کے خلاف لڑنا چاہئے اور اُسے ختم کر دینا چاہئے۔ عہدوں کا قبول کرنا ہماری جنگ آزادی کا ارتقائی پہلو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس دستور کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ایک دستوری مجلس قائم کرنا آج بھی اُسی طرح ہمارا خاص نصب العین بنا ہوا ہے جس طرح کل تھا۔ عہدے قبول کرنے کا مطلب ذرا برابر بھی یہ نہیں کہ ہم نے اس غلامی کے دستور کو منظور کر لیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مجلس قانون ساز کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ مجوزہ وفاق کے خلاف لڑیں گے۔

انہی سب باتوں پر ورکنگ کمیٹی کی تجویز میں زور دیا گیا ہے۔ اور دوبارہ اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہم مجلس قانون ساز میں سامراجی کاروبار میں تعاون اور شراکت کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے اور برطانوی سلطنت کے درمیان جو خلیج ہے وہ پاٹی نہیں جا سکتی۔ ہمارے خیالات اور ہمارے نصب العین اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے مجالس قانون ساز میں جانے یا عہدے قبول کرنے سے ہمارا مقصد باقاعدہ دستور کے مطابق کام کرنا نہیں ہے بلکہ اس بات کی کوشش کرنا ہے کہ وفاق عملی شکل میں نہ آسکے اور اس کے ذریعے اس دستور کی لغویت کو ثابت کرنا اور دستوری مجلس اور آزادی کے لئے زمین تیار کرنا ہے۔ مزید براں ہمارا مقصد عوام کو قوت پہنچانا اور اس دستور کی تنگ حدود کے اندر رہتے ہوئے جہاں کہیں ممکن ہو عوام کے بار کو ہلکا کرنا ہے۔ تمام کانگریسیوں کو چاہئے

کہ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔

آخری تین مہینوں میں اور ان کے بعد کے زمانے میں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کانگریس عہدوں کی اور ان کے ذریعے فائدے اٹھانے کی دلدادہ نہیں تھی۔ عہدے تو بغیر ہمارے مانگے ہی ہمارے تھے اگر ہم اپنی طبیعت انھیں قبول کرنے پر آمادہ کرلیتے۔ لیکن ہم نے تو اس سوال پر ہمیشہ اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ آزادی کی جدوجہد کے لئے لوگوں کی قوت کو بڑھایا جائے۔ ہم تامل کرتے رہے اور اس کی کوشش کرتے رہے کہ اپنے کام کے لئے راستہ صاف کریں (اور عہدوں کے قبول کرنے کے فوائد اور نقصانات کا اندازہ لگاتے رہیں) اس میں شک نہیں کہ اس تین مہینے کے عرصے نے کانگریس کی پوزیشن کو واضح اور زیادہ مضبوط کردیا۔ اب اگر ہم عہدے قبول کرتے ہیں تو اس میں ہمارے پیش نظر ایک بڑا مقصد ہے اور ہم عہدوں کو چھوڑدیں گے۔ جب ہم اس مقصد کے لئے کسی دوسرے بہتر طریقے سے کام کرسکیں گے۔

حالات کا اقتضا ریہی تھا کہ ورکنگ کمیٹی موجودہ تجویز منظور کرے اور مجھے امید ہے کہ تمام کانگریسی نہایت خلوص کے ساتھ اس کی پیروی کریں گے۔ لیکن اس تجویز میں جو روح کام کررہی ہے.........

....

اس کے ساتھ خلوص کا اظہار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مجالس قانون سازی کے باہر ہم اپنا کام اور بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھیں ہمارے نظر میں ہمیشہ مقاصد کی نسبت صحیح رہنی چاہئے۔ ہماری اصل طاقت مجالس قانون ساز کے باہر ہے۔ اسی سے ہمارے مجالس قانون ساز کے

کاموں کو بھی تقویت پہنچتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہی آنے والی جدو جہد کے لئے بھی قوت کا باعث ہو گی۔ سابقہ تجویزوں کی طرح اس تجویز کی بھی یہی اہمیت ہے۔

ہم نے ایک نیا قدم اُٹھا کر نئی ذمے داریاں اور کچھ خطرے اپنے سر لے لئے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے مقاصد پر سچائی سے قائم رہیں اور ہر وقت ہوشیار رہیں تو ہم ان خطروں پر غالب آ جائیں گے اور یہ نیا قدم بھی ہمیں قوت اور طاقت بخشے گا۔ آزادی کو باقی رکھنے کے لئے ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے۔

۱۰ر جولائی ۱۹۳۷ء

(۲)

ورکنگ کمیٹی میں عہدے قبول کرنے کی تجویز کی منظوری اور اس کے بعد چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے قیام نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ بہت سے کانگریسی اس کو ایک خطرناک اقدام سمجھتے ہیں۔ بہت سے اس تبدیلی سے اہم باتیں رونما ہونے کی توقع کر رہے ہیں۔ یہ دونوں ردِ عمل بالکل فطری ہیں۔ ہم ایک حد تک اس راستے سے ہٹ گئے ہیں جس پر ہم عرصے سے چلے آ رہے تھے۔ ایسی صورت میں ایک نئے راستے پر چلنے میں ہمیں جو پس و پیش ہے وہ بالکل ناگزیر ہے۔ بعض کو یہ خطرہ ہے کہ آگے کوئی گڑھا نہ ہو۔ بعض اس امید میں ہیں کہ اس پر آسانی سے چلے جائیں گے۔ لیکن ہم سب لوگوں نے جو کانگریس کے ذریعے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے اور اسی لیے عظیم الشان انجمن کی روایات کے مطابق ہم میں سے

ہر ایک نے ایک دوسرے پر بھروسہ کیا ہے۔
اگر آزمودہ کار کانگریسی نئے راستے پر چلنے میں پس و پیش کر رہے ہیں تو پھر عوام کا تو نہ جانے کیا حال ہوگا؟ وہ ہماری پالیسی کے اس نئے رُخ کے متعلق نہ جانے کیا خیال کرتے ہوں گے اور اب انھیں کانگریس سے کیا اُمیدیں ہوں گی؟ کیا ان میں سے کسی کو یہ خیال ہے کہ ہماری آزادی کی جد و جہد ختم ہو گئی۔ کیونکہ کانگریسی بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ہیں؟ کیا وہ بے وقوفی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سوراج قریب آ گیا ہے؟ یقیناً وہ یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہوں گے کہ اُنکے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ جو بالکل اُن کے ساتھ جیل میں تھے۔ آمریت کی ان عمارتوں میں جو برطانوی سامراج کا ملجا و ماویٰ ہیں، حکومت و اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ سرخ پگڑی والے چپراسی ان کے آس پاس گھومتے رہتے ہیں اور اختیار کی ناپائدار خوشبو نے اُنھیں معطر کر رکھا ہے۔ وہ ضرور تعجب سے کہتے ہوں گے کہ ہمارے ان ساتھیوں کو کیا ہو گیا؟ آخر حالات کی وہ کون سی حیرت انگیز کایا پلٹ تھی جس نے کل والے مجرموں کو اُٹھا کر آج کا وزیر بنا دیا؟ کیا وہ ہم غریب فاقہ مستوں کو، جو اپنی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے اُن کا آسرا تک رہے تھے، بھول گئے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا؟ یا وہ اب ہمیں اس فرحت بخش سرزمین میں لے جا رہے ہیں۔ جہاں دودھ اور شہد کے چشمے اُبلتے ہوں ایک زمانے میں جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے اور جو ہماری اس موجودہ دنیا سے بالکل مختلف ہوگی۔
ان کے تصور کی یہ دونوں تصویریں غلط ہیں۔ ہم نے اُنھیں چھوڑا نہیں اور ہم اب بھی اسی طرح اُن کے ساتھی ہیں جیسے پہلے تھے۔ اگرچہ ہم

ہوئے کچھ لوگ حکومت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ لیکن ہمارا لباس وہی کھدر ہے۔ اور ہمارے دماغ انھی خیالات سے پر ہیں۔ ہماری منزل اب بھی وہی ہے اور اسی نے ہم پر یہ لازم کر دیا ہے کہ ہم اس کی طرف بڑھیں اور وہی ہمیں عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن ہم ہنوز اس منزل سے دور ہیں اور وہ طاقت جس کے ذریعے ہم اپنے ملک کی قسمت کو بنا سکیں ابھی ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی۔ اگرچہ کانگریس کے کچھ لوگ وزیر ہو گئے ہیں لیکن یہ سوراج یا کانگریس راج نہیں۔ تاہم ہمیں عوام کی قوت پہچاننے اور ان کی خدمت کرنے کا ایک نیا موقع ملا ہے۔ شاید ہم ان کی منظم طاقت اور ان کی اس فہم و فراست پر منحصر ہے جس سے وہ موجودہ واقعات کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔

اس لئے ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم عوام کے پاس پہنچیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس سے انھیں اچھی طرح آگاہ کریں۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی تجویز اُنھیں سنائی جائے اور ان کے سامنے اس کے تمام پیچیدہ حصّوں کی تشریح کی جائے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جانی چاہیے کہ یہ تبدیلی اگرچہ بظاہر نمایاں معلوم ہوتی ہے لیکن برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کے درمیان وہ پرانی کش مکش بدستور جاری ہے۔ اور اس کش مکش پر قابو پانے کے لئے ہمیں جس قوت کی ضرورت ہے وہ ہم انھی لوگوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں سے نہیں۔ نیز ہمارے وہ ساتھی جو آج عہدے دار ہیں اور جو اس کٹھن اور ذمے داری کے کام میں جسے انھوں نے اپنے سر لیا ہے، ہماری ہر طرح کی امداد اور ہمدردی کے خواہش مند ہیں، صرف اُسی وقت موثر طریقے سے کام کر سکیں گے۔ جب عوام فہم و فراست سے کام لیں اور کانگریس کے مطالبے کو پرزور طریقے سے آگے بڑھائیں۔

لہذا میری یہ رائے ہے کہ اس مقصد کے لئے ہندوستان کے ہر قصبے اور گاؤں میں یکم اگست کو اتوار کے دن جلسے کئے جائیں۔ ان میں ورکنگ کمیٹی کی تجویز پڑھ کر سنائی جائے اور لوگوں کو وضاحت سے اس کے معنی سمجھائے جائیں۔ اور جب کانگریسی وزیروں کو دوستانہ مبارکباد پیش کی جائے تو اس وقت آزادی حاصل کرنے اور اپنی قوم کی غربت کو دور کرنے کے لئے ہمیں از سر نو قسم کھانی چاہیئے۔ اسی دن ہر جگہ جھنڈے کی سلامی کی رسم بھی باضابطہ طور پر ادا کی جائے۔ اگست کی پہلی تاریخ ہمارے لئے ایک خاص خصوصیت رکھتی ہے۔ عرصہ ہوا جب اس تاریخ کو ہندوستان کی آزادی کی نذر کر دیا گیا تھا۔ سات سال گذرے اسی تاریخ کو لوکمانیہ جی کا انتقال ہوا تھا۔ اور اسی دن ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی گئی تھی اور اس ہتھیار کو استعمال کیا گیا تھا۔ جس نے ہماری قوم کو اتنا مضبوط اور طاقتور بنا دیا ہے۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ اس دن کو معقول طریقے سے منائیں۔ ہمیں اپنی ماضی کو یاد رکھنا چاہیئے اور اپنے مستقبل کا اسی عزم صمیم کے ساتھ قصد کرنا چاہیئے۔ جس پر ہم عرصے سے کاربند ہیں۔

ہماری صوبجاتی حکومت میں ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اگرچہ یہ تبدیلی اس تعلق پر جو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ہے کوئی اہم اثر نہیں ڈالتی۔ لیکن ہمارے ملک کے سب لوگوں پر اس کا اثر ضرور پڑنا چاہیئے خواہ وہ حکومت کے ملازم ہوں یا نہ ہوں۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ ہر ہندوستانی اپنے ملک کی مدد کے لئے باہر نکلا اور اس بڑے کام میں کانگریس کے ساتھ تعاون کیا جو اس نے اپنے سر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر ہندوستانی جو اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑتا ہے، اپنی اس ہمدردی اور نیک نیتی کو شگون نیک

سمجھ کر کھدر پہنے گا جو ہماری آزادی کی وردی ہے اور قومی جھنڈے کا منتا! برم کرے گا۔ اور اس پر عقیدت کے پھول چڑھائیگا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ پولیس کے سپاہی اب تک ہم لوگوں پر تشدد کرتے رہے ہیں اب بجائے اپنے غیر ملکی آقاؤں کی بھلائی کے ہندوستان کی بھلائی چاہیں گے اور عوام کا تعاون اور اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ کانگریسی وزارتوں کے اگر کچھ بھی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ ان کے عہد میں عوام کے مفاد کو برتری حاصل رہے۔

اگست کی پہلی تاریخ نہ صرف کانگریسی بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی منائی جانی چاہیئے۔ ان دوسرے صوبوں میں جو تجاویز منظور کی جائیں ان میں مناسب تبدیلی کی جائے۔

۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء

سرکاری ملازموں کی تنخواہیں

کانگریسی وزارتوں کی آمد نے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں تخفیف کے سوال کو ایک اہم مسئلہ بنا دیا ہے۔ ایک طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کانگریسی وزراء اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بہت کم تنخواہیں لے رہے ہیں، اور دوسری طرف یہ نظر آتا ہے کہ بہت سے سرکاری ملازموں کو جو اعلیٰ عہدوں پر کام کر رہے ہیں بہت بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وائس چانسلر اور دوسرے علمی کام کرنے والے لوگ بھی اپنے فن، علم اور خدمت قوم کا اندازہ بڑی بڑی تنخواہوں سے کرتے ہیں۔ ادھر پنجاب اسمبلی میں ہم نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ اراکین نے اپنے روزانہ بھتوں کی شرح اتنی بڑھا لی ہے، جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ یہ دونوں تصویریں کافی جاذبِ توجہ ہیں۔ مگر اس کے بعد بھی شاید کم لوگ ہی کانگریسی وزراء اور دوسرے لوگوں میں جو اصلی فرق ہے اُسے اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ یہ فرق خاصا ہے اگر صرف تنخواہ کی

رقم ہی دیکھی جائے ۔ لیکن یہ اور بھی بڑا معلوم ہوتا ہے اگر ہم یہ دیکھیں کہ تنخواہ لینے والے بالکل مختلف قسم کے لوگ ہیں۔

بنیادی حقوق کے متعلق کراچی کی تجویز یہ تھی کہ "ملکی شعبوں کے اخراجات اور ان میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں بہت کمی کردی جائے گی۔ ریاست کے کسی ملازم کو سوائے ان ماہرین کے جو خاص طور سے ملازم رکھے گئے ہوں یا اسی قسم کے اور لوگوں کے کسی کو ایک خاص رقم سے زیادہ تنخواہ نہیں ملے گی اور اس رقم کو معمولاً پان سو سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ پانسو روپے کم و بیش وہ رقم ہے جو بڑی سے بڑی تنخواہ کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وزرا اور دوسرے بڑے عہدے داروں کو لازمی طور پر زیادہ سے زیادہ تنخواہ ملے۔ کانگریس کی تجویز دو اصولوں پر مبنی ہے :-

(۱) تنخواہوں کا معیار ملک کی غربت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے اور اس لئے لوگوں کو صرف اپنی تنخواہ ملنی چاہیئے جو ان کی کارکردگی کو قائم رکھ سکے۔

(۲) تنخواہوں کا تعین کسی خاص شخص کے عہدے کی حیثیت یا اہمیت کے مطابق نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ان اصولوں میں سے پہلا اصول عام طور سے تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن دوسرے اصول کی نسبت مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اب تک ان طرح نہیں سمجھا جاسکا ہوگا۔ حساس لوگ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر ہیں کہ کسی غربت کی ماری قوم سے بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرنا ایک طرح بے حیائی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ان مزدوروں سے بڑے بڑے منافع کمانا جن کی اجرت بہت ہی کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلی خرابی ا

نامعقولیت اس نظام میں ہے جو اس قسم کی چیزوں کو گوارا کرتا ہے اور ترقی دیتا ہے۔ ہم اپنی دنیاوی ترقی اور اپنی اہمیت کو آمدنی کے معیار سے دیکھنے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ کسی دوسرے نہج پر ان باتوں کے متعلق کچھ سوچنا مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ معیار بالکل غلط اور تباہ کن ہے اور جہاں زر کی قدریں اس قدر فروغ پا جائیں وہاں آدمیوں میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے لیکن اپنے اس زر کے عہد میں بھی ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ ایک غریب سائنس دان یا مصنف کی قدر تمدنی اور جماعتی اعتبار سے اکثر ایک مالدار تاجر یا ایک بڑی تنخواہ پانے والے اعلیٰ افسر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ایک تعلقہ دار یا ایک بڑا زمیندار خطیر آمدنی کا مالک ہوتا ہے لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ جماعت کے لئے اس کی قدر کیا ہے۔ بعض لوگوں کو تو اسی میں شک ہے کہ جماعت کے لئے اس کی کوئی قدر ہے۔

اس لئے ہمیں اس طریقے کو ترک کر دینا چاہیئے کہ لوگوں کی عزت کا معیار اُن کی آمدنی یا تنخواہوں کو بنائیں۔ غالباً اگر جانچنے کا یہ معیار اُلٹ دیا جائے تو ہمارے لئے ایک زیادہ محفوظ راستہ نکل آئے گا۔ اس سوال سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہمارے جماعتی نظام کی ترتیب چاہتا ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے میں نہایت یقین کے ساتھ اس کے لئے بھی اس اشتراکی حل کی طرف اشارہ کر سکتا ہوں جو میں نے مشکلات کے لئے تجویز کیا ہے۔ لیکن اس وقت تو ہمیں سرکاری ملازموں کی تنخواہوں سے بحث ہے۔

کانگریس جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے یہ اصول سرکاری ملازمتوں کی تنخواہوں کے متعلق کرنا چاہتی ہے کہ ان کی تنخواہیں ہندوستان کے حالات سے مناسبت رکھتی

ہوں، اور وہ خوفناک خلیج جو سرکاری عہدے داروں اور کسانوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے کم ہو جائے، اور جہاں تک ممکن ہو وہ محاصل جو ان سے وصول کئے گئے ہیں، سوشل سروس اور دوسری خدمات کی شکل میں انہیں واپس کر دئے جائیں۔ وہ اس رواج کو ختم کر دینا چاہتی ہے کہ جتنا بڑا عہدے دار ہو اتنی ہی زیادہ اس کی تنخواہ ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ تنخواہیں اس عہدے کے لحاظ سے مقرر نہ ہوں جس پر لوگ کام کرتے ہیں بلکہ اس شخص کی ضرورت کے لحاظ سے ہوں جو اس پر کام کرتا ہے۔ یعنی اصولاً ایک ایسا بہترین نظام ہو جس میں کم و بیش تمام خدمات اور تمام عہدوں کے لئے ایک ہی معاوضہ مقرر ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ چیز ممکن نہیں۔ اگر کوئی معیار مقرر کر دیا جائے تو بھی فرق ضرور پیدا ہوگا۔ تاہم کوئی معقول وجہ اس کی نہیں معلوم ہوتی کہ آخر ایک وزیر کو صرف اس کے عہدے کی وجہ سے اس کے سکریٹری سے زیادہ تنخواہ کیوں دی جائے۔ ایک حد تک بعض موقعوں پر یہ ضروری بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وزیر کو زیادہ تنخواہ دی جائے اس لئے کہ ممکن ہے اس پر اپنے کام کے علاوہ اور بھی ذمہ داریاں ہوں، لیکن وہ اصول جس پر ہم قائم رہنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ کسی وزیر کو اس کے سکریٹری سے زیادہ تنخواہ صرف اس وجہ سے نہ ملنی چاہیئے کہ وہ وزیر ہے۔ یہی قاعدہ دوسرے عہدوں پر بھی منطبق کیا جائے گا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسری تنخواہیں بھی اسی زیادہ سے زیادہ شرح کے لگ بھگ ہوں گی جو معین کر دی گئی ہو۔ تمام تنخواہوں کی شرح تو یقیناً کم سے کم ہونی چاہیئے یہ زیادہ سے زیادہ اسی وقت استعمال کی جائے جب اس کی واقعی ضرورت ہو۔

لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ رواج کو اچانک سر سے پاؤں تک بدلنے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ علاوہ ان عیبوں کے جو ہمیں برطانوی حکومت سے ملے ہیں، اس رائج الوقت معاشرت، لوگوں کی عادتوں اور بہت سی دوسری چیزوں سے

سابقہ پڑے گا۔ اوراس وقت ہمیں یک بارگی بہت سے الجھے ہوئے مسائل کا مقابلہ کرنا ہے۔ جو فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ فی الحال ہمیں مخصوص مثالیں پبلک کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ لیکن یہ مسئلہ بنیادی اور اہم ہے اور ہمیں جلد از جلد پوری طرح اس کے متعلق کوئی تصفیہ کرلینا چاہیئے۔ اس وقت ہم نے عارضی طور پر وزیروں اور دوسرے لوگوں کی تنخواہیں قریب قریب کراچی ریزدلیوشن کے مطابق رکھی ہیں یہ تنخواہوں کی اونچی سے اونچی شرح ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب لوگ حسب قاعدہ یہی تنخواہ لے سکتے ہیں۔

بھتے کے سوال کا تنخواہوں کے سوال سے بہت قریبی تعلق ہے۔ بعض عہدوں کے ساتھ یہ لازمی ہے کہ کارکردگی کو بڑھانے اور کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے کوئی مضاعف رقم دی جائے۔ لیکن بھتے کو تنخواہوں کا جزو نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ تنخواہوں کی تخفیف کا سارا مقصد خاک میں مل جائے گا۔

جب ہم ایک طرف اعلیٰ عہدے داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف ہم تمام لوگوں کے لئے اتنی اجرت کا انتظام بھی کرنا چاہتے ہیں جو انہیں زندہ رکھ سکے۔ نیز یہ بھی چاہتے ہیں کہ عوام کا معیار حیات بلند ہوجائے۔ یہ سوال کہ یہ چیز موجودہ حالات میں کہاں تک ممکن ہے ایک الگ بات ہے۔ ہمارے سامنے جو مقصد ہے وہ غربت کو جاری رکھنا نہیں ہے بلکہ اسے ختم کرنا اور عام معیار کو جہاں تک بھی ممکن ہو بلند کرنا ہے تاکہ ہر شخص اس عہد کی تہذیب سے استفادہ کرسکے۔ اس کام کے لئے اہم قسم کی جماعتی اور سیاسی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ اسی اثنا میں ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ چند خوش نصیبوں اور کروڑوں بدبختوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہوگئی ہے اسے کم سے کم کردیں۔

جوں ہی موقع آئے گا ہم بھتوں اور تنخواہوں کے سوال پر غور کریں گے اور اس بارے میں کانگریسی وزیروں کا مشورہ لیں گے، تاکہ کراچی کی تجویز کی روح پر عمل کر سکیں۔ اور اس خیال کو ختم کر دیں کہ آدمی اور اس کے کام کی قدر و قیمت کو پرکھنے کا ذریعہ وہ تنخواہ ہے جو اُسے ملتی ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء

ہندوستانی فوجوں کو چین بھیجنا

برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستانی فوجوں کا شنگھائی بھیجا جانا ایک نہایت اہم معاملہ ہے۔ اور ہندوستان کے لئے تشویش کی بات ہی۔ برطانیہ کی پرانی پالیسی یہی ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کی مرضی حاصل کئے بغیر، ہندوستانی فوجوں کو باہر بھیجدیتی ہے۔ یہ کارروائی بھی اسی سلسلہ میں کی گئی ہی۔ کانگریس نے اس پالیسی پر نفرت کا اظہار کیا ہی اور پر زور طریقہ سے یہ اعلان کیا ہی کہ ہندوستان اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ اس کے آدمیوں اور اس کی فوجوں سے فائدہ اٹھاکر اسے نقصان پہنچایا جائے اور برطانوی سامراج کو نفع۔

ہندوستانی فوجوں کو شنگھائی بھیجنے کی مصلحت ہمیں یہ سمجھائی گئی ہی کہ وہ وہاں جاکر ہندوستان کے مفاد کی حفاظت کریں گی۔ یہ ہندوستان کا مفاد کیا ہی، اسے تو شاید چند ہی لوگ جانتے ہوں، مگر یہ بات اظہر من الشمس ہی کہ جس مفاد کی حفاظت مقصود

ہے وہ برطانیہ کا مفاد ہے۔ اور اگر بالفرض ہندوستانیوں ہی کے مفاد کی حفاظت ہو تو اس کے متعلق ہندوستانی قوم کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ کیا تدبیر اختیار کرنا چاہتی ہے۔ لہذا ہندوستانی قوم کی مرضی کے خلاف اس طرح ہندوستانی فوجوں کا بھیجا جانا ہندوستان کی توہین ہے۔ اگرچہ خود یہ معاملہ بہت معمولی ہو سکتا ہے، مگر آگے چل کر اس سے اہم نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ ہم طرح طرح کی غیر متوقع مشکلات کا شکار اور اس کی وجہ سے غیر ارادی طور پر جنگ میں مبتلا ہو جائیں۔

کانگریس ہمیں بار بار جنگ کے خطرہ سے آگاہ کر چکی ہے۔ اور اس نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ سامراجی جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے خلاف ہے یہ کوئی خالی خولی تنبیہہ نہیں بلکہ یہ اعلان ان تمام مسائل پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کیا گیا ہے جو آنے والی جنگ کی وجہ سے رونما ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے اعلان پر اب تک قائم ہے۔ درحقیقت حالات نے دنیا کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ پیہم لڑائیوں اور ہنگاموں کا شکار ہوتی چلی جائے۔ ہسپانیہ کی لڑائی کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا اور ابھی تک اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ چین اور جاپان کی لڑائی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کئی سال تک اس کے جاری رہنے کا امکان ہے۔ اس لڑائی کی ابتدا بالکل جدید طریقہ کے مطابق ہوئی یعنی اعلان جنگ کی بجائے حملہ آور نے چھوٹتے ہی گولے برسانے شروع کر دئے جن کی وجہ سے ہزاروں آدمی تباہ و برباد ہو گئے۔ لڑائیاں شروع آسانی سے ہو جاتی ہیں مگر ختم آسانی سے نہیں ہوتیں۔ وہ پھیلتی ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھی اپنے ساتھ فنا کر دیتی ہیں۔ یہ ہے دنیا کا مستقبل جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اب اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ایک بین الاقوامی جنگ چھڑ جائے، جس کے شعلے انسانیت کو جلا ڈالنے پر تلے بیٹھے ہیں اس تاریخی ہنگامے کا ہم کس طرح مقابلہ کر سکیں گے؟ یقیناً ہم برطانوی سامراج کے پیرو

بنا کر کہ اس کے حکم سے اس کی لڑائیوں میں شریک ہوں اور اس کے مفاد کی حفاظت کریں
اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اپنے صوبہ جاتی کاموں کی اہم مصروفیتوں اور اپنے ملک کے ضروری مسائل میں الجھ کر ہم اس زبردست صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور جس کا ایک ریلا ہماری تمام سکیموں اور تدبیروں کو الٹ کر رکھ سکتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان کے سامنے بھی اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہی ہے، اور اس فیصلہ میں کہ اس کا کس طرح مقابلہ کیا جائے، ہندوستان کے لوگ بھی اپنی رائے دیں گے، اور لازمی طور پر ان کی خواہشوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ کانگریس والوں کو اس معاملہ میں اپنی بیدار مغزی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو وہ اپنے گھر مصیبت کو دعوت دیں گے۔

لہذا ہندوستانیوں کو اپنی فوجوں کے چین بھیجے جانے کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے۔ مشرق بعید کی اس جنگ میں چین کے ساتھ ہماری ہمدردی کا ہونا ایک ناگزیر بات ہے، اور ہم دعا کرتے ہیں، وہاں کے لوگ سامراجی تشدد کے ہاتھوں سے اپنی آزادی بچا لینے میں کامیاب ہوں۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اس بین الاقوامی کھیل میں ہماری ملکی دولت اور ہمارے آدمی دوسروں کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہرے بن جائیں۔ آج ہم صرف احتجاج ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ پالیسی جاری رہی تو اس احتجاج کی پشت پر کانگریس کی پوری طاقت ہوگی۔

۲۵ اگست سنہ ۱۹۳۷ء